ڈاکٹر عشرت بیتاب

BE - SAMAR HAYAT

Collection of Urdu Short Story

By Dr. Ishrat Betab

NAWAZ PUBLICATION
ZEB KADAH, JAHANGIRI MOHALLA,
ASANSOL-713302 (W.B.)

ضابطہ

- عنوان: بے ثمر حیات (افسانے)
- مصنف: عشرت بیتاب (ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی)
- پیدائش: ۱۹۵۲ء بمقام شیخ پورہ (بہار) • پیشہ: درس و تدریس
- طبع اول: ۱۹۹۶ء • تعداد: ایک ہزار (۱۰۰۰)
- ناشر: نواز پبلی کیشنز، ذیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول ۷۱۳۳۰۲
- کتابت: محمد سراج • مطبوعہ:
- مراسلت کیلئے: (گھر) ذیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول ۷۱۳۳۰۲، مغربی بنگال

(دفتر) مدرس اعلیٰ، قاضی نذرالاسلام اسکول، جہانگیری محلہ، آسنسول ۷۱۳۳۰۲

تقسیم کار

- آسنسول: تنویر بک ڈپو، نشاط بک ڈپو، حنفی بک ڈپو، جی ٹی روڈ، (نیو سینما)، آسنسول ۱
- کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، ۱۲۵، کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۷۳
- پٹنہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴
- دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیزالدین وکیل، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Rs. 80/-

قیمت: ۸۰ روپے

ڈاکٹر عشرت بیتاب

افسانے

انتساب

میں اس ادبی کاوش کو

اپنی ماں

محترمہ **زیب النساء** مرحومہ

زوجہ

غلام مجتبیٰ صاحب مرحوم

کی ذاتِ بابرکت کے نام معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

جن کی دعائے نیم شبی کے فیض سے

مجھے تحصیلِ علم اور لکھنے پڑھنے کی توفیق ملی

اور

انشاء اللہ آئندہ بھی ادبی مشاغل کی راہ میں

ہموار رہوں گی۔
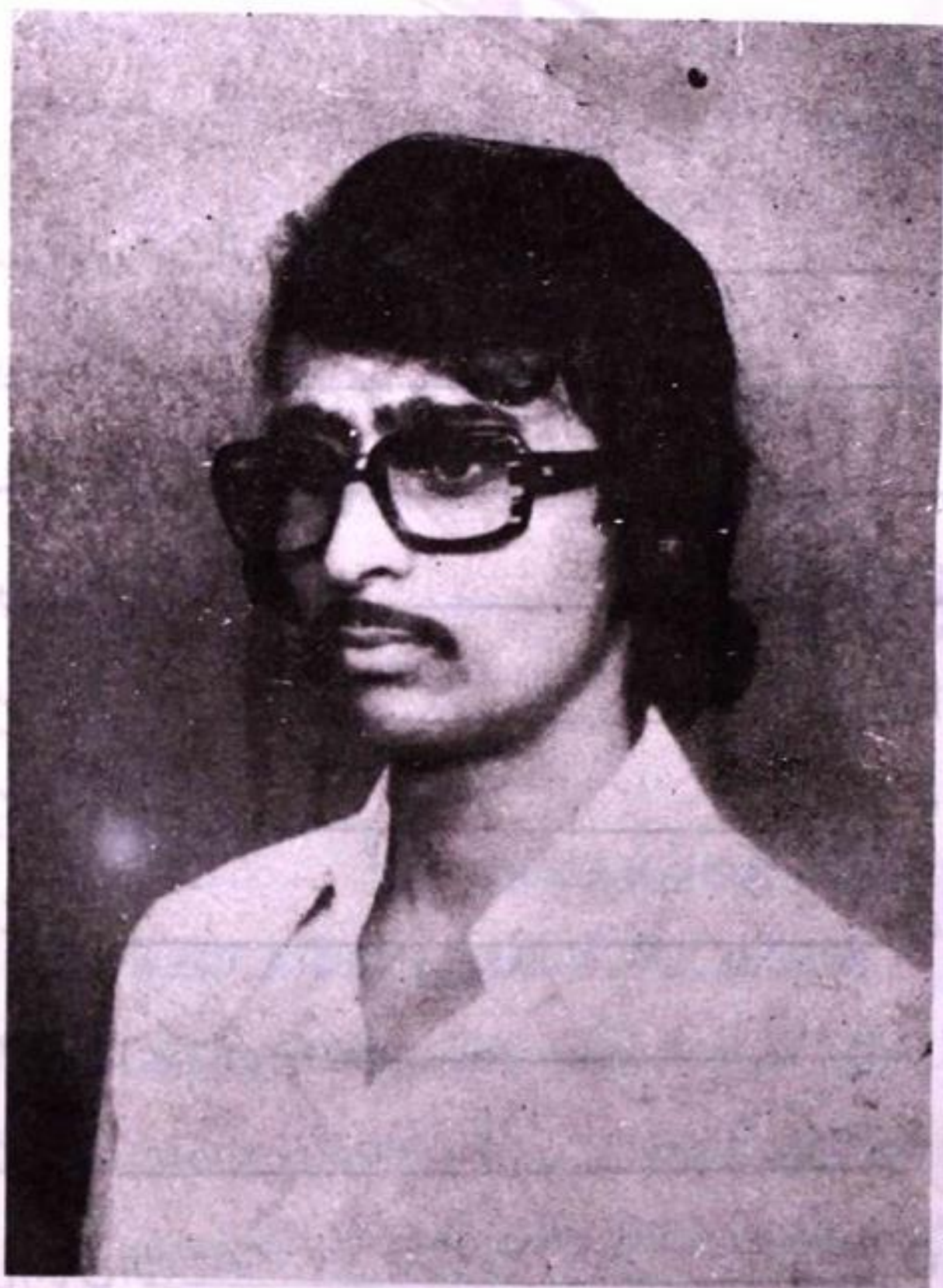
ڈاکٹر عشرت بیتاب

ترتیب

ایک نئی نورجہاں

آخر میں میری باری تھی۔

مجھ سے قبل کے قصہ گو نے رومانیت کے شیشے میں اترتی ہوئی زندگی کے نشیب و فراز کے ایسے قصے گڑھے تھے کہ ساری فضا پر سکوت سا چھا گیا تھا۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی، جیسے سبھوں کے دلوں پر کسی نے شب خوں مار دیا ہو۔ رومان کی سوندھی اور میٹھی خوشبو میں گندھی کہانی نے قافلہ والوں پر کیف آگیں سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

میں تھوڑی دیر سوچتا رہا ــــــ پھر یوں گویا ہوا۔

میری کہانی کا ہیرو سلیم تو کوئی شہزادہ تھا نہیں اور نہ ہی خرم کی جیسی آب و ہوا میں اسکی پیدائش یا پرورش ہوئی تھی لیکن تھا تو سلیم ــــــ جس کی رگ رگ میں باغیانہ جذبے پنہاں تھے۔ رئیس باپ کی شوخ اولاد۔

رئیس الدین کی ایک ہی تو اولاد تھی اور وہی ان کی بے انتہا دولت کا تنہا وارث تھا جس سے طبیعت میں بے جا شوخی تو آنی ہی تھی اپنی ضد پر اڑ جاتا تو شہنشاہِ وقت کو بھی جھک جانا پڑتا۔

"بالکل شہزادہ سلیم کی سی عادت تھی" — حاضرینِ مجلس میں سے کسی نے کہا۔
ہاں! باغیانہ ذہن تو شہزادۂ سلیم کا سا ہی پایا تھا۔ اسی پر رئیسانہ ٹھاٹ نے طبیعت میں رومانیت کے ساتوں رنگ ایک ساتھ گھول دیئے تھے۔ لیکن قسمت کا لکھا کبھی ٹلتا نہیں۔ لاکھ تدبیریں کرو ہاتھ کی ریکھاؤں کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔
"ہاتھ کی لکیروں کو بدلنے کی کیا ضرورت آن پڑی؟" سامنے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا۔
اس لئے کہ ہاتھ کی ریکھاؤں میں انارکلی، جو نہیں تھی۔
"اچھا — یہاں بھی سلیم کی انارکلی آن ٹپکی" حاضرینِ مجلس میں بیشتر لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔
جی ہاں — مگر یہ انارکلی مطلق العنان شہنشاہ کے دربار کی رقاصہ نہیں تھی بلکہ سلیم کے گھر کی ایک معمولی خادمہ تھی۔
سلیم کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد ہی اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا بچے کی ممتا میں رئیس الدین دوسری شادی کیلئے تیار نہ تھے اسلئے مجبوراً سلیم کی دیکھ ریکھ کے لئے انھوں نے پڑوس کی ایک غریب بچی کو رکھ لیا۔ اس طرح ایک یتیم بچے کی کفالت کرنا بھی مقصود تھا اور سلیم کی دیکھ ریکھ بھی۔
بچی سات آٹھ برس کی تھی۔ سیرت نام تھا اس کا۔ نام کی طرح صورت بھی دل آویز تھی۔ گول مٹول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، بلند پیشانی اور اس چھوٹی سی عمر میں کولہے تک جھولتے لمبے لمبے بال۔ صاف ستھرا رنگ — آتے ہی سلیم کو گود میں اٹھا لیا۔ سلیم اس وقت ڈھائی تین سال کا ہوگا۔ سیرت اسے سارا سارا دن ڈھوئے ڈھوئے پھرتی۔ فرش پر اتارتی نہیں۔ بہت پیار کرتی — نہلاتی، دھلاتی اور سنوارتی رہتی۔ سیرت خوش تھی کہ اسے دو وقت کا کھانا مل جاتا تھا ورنہ باپ کی بے وقت موت نے تو اسکے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا تھا ماں تنہا کس کس کی کفالت کرتی۔ پڑوس کے جوٹھے برتن دھو دھو کر کہاں تک سبھوں کا پیٹ بھرتی۔ سیرت کے علاوہ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی بھی تھے۔ باپ ایک معمولی

ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اچانک بیماری نے آگھیرا اور پھر جیٹ پٹ اللہ کا بلاوا بھی آگیا۔ نہ کوئی پس انداز کی ہوئی رقم تھی اور نہ ہی سرکاری ملازمت تھی کہ سرکاری تحویل سے کچھ ملتا۔ ڈرائیور صاحب کی اپنی جان توڑ محنت تھی کہ دو وقت کی روٹی شکم سیر ہو کر سب کھا رہے تھے کہ اچانک فرش سے عرش پر اٹھ گئے اور ان کے بچے دیکھتے دیکھتے فاقہ کشی کی دلدل میں گرتے چلے گئے۔ شروع شروع میں کچھ دنوں تک اڑوس پڑوس اور رشتہ داروں کا تعاون رہا لیکن آہستہ آہستہ سبھوں نے اپنے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور پھر سیرت کی ماں لاچاری اور بے بسی کی چادر میں لپٹتی چلی گئی۔

لیکن جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے ــــــ۔

پڑوس میں ہی رئیس الدین رہتے تھے۔ شروع میں علاج معالجہ سے لیکر کفن دفن تک کے خرچ میں معاونت کرتے رہے آخر میں ان سے رہا نہ گیا اور سیرت کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس طرح انھیں بن ماں کے بچے کی دیکھ ریکھ کیلئے ایک آیا مل گئی اور سیرت کی کمزور ماں کو ایک بھاری بوجھ سے چھٹکارا حاصل ہو گیا۔ وہ خوش تھی کہ رئیس الدین صاحب کے ہاتھوں اس کا مقدر سنور جائے گا۔

لیکن جس کے مقدر کو بگڑنا ہی نصیب ہو اسے لاکھ لوہے کے سانچے میں ڈھال کر رکھو، بگڑ کر ہی رہے گا۔ سیرت اپنی پوری توجہ سلیم پر رکھتی اور سلیم بھی اسکی چاہت، انسیت اور قربت کی تپش سے موم کی طرح اس کی اور پگھلتا چلا جارہا تھا۔

سلیم یوں تو اب سیرت کی خدمت کا طلب گار نہیں رہتا لیکن قربت کے احساس کی میٹھی آنچ میں تپ ضرور رہا تھا۔ اس کا احساس اس وقت اور بھی جاگ اٹھا جب سیرت کے لئے لڑکا تلاش کیا جانے لگا۔

رئیس الدین چاہتے تھے کہ اپنی حیات میں ہی سیرت کے ہاتھ پیلے کردیں لیکن سیرت کے ہاتھ پیلے ہونے کی خبر سے ہی سلیم کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور وہ اپنے اندر کچھ ٹوٹتا پھوٹتا محسوس کرنے لگا۔ سیرت کی انسیت کی دبیز چادر کے نیچے سلیم کی محبت کا جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔

"یہ ممکن نہیں" ــــــ رئیس الدین نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا ــــــ" کہ سیرت

بیٹی کی طرح پلی ہے اور بیٹی کو باپ کا گھر چھوڑنا ہی ہوتا ہے اور پھر سلیم سے وہ کافی بڑی بھی ہے"۔

لیکن سلیم کو کون سمجھاتا وہ تو کہتا ـــــ "آگ کی تپش عمر کی تمیز نہیں کرتی، سبھوں کو یکساں جھلساتی ہے"۔

سیرت نے تو شروع سے ہی خود کو سلیم کی خوشنودی کیلئے وقف کر رکھا تھا اس کے رگ و پے میں سلیم سرایت کر گیا تھا لیکن بلوغیت کی اس سرشاری سے وہ آگاہ نہ تھی۔ کہ سلیم اس کو اس نوعیت سے بھی اپنی اور کھینچ رہا ہے وہ تو خادمہ تھی خدمت اس کا مذہب تھا لیکن تن من کی اس خدمت سے وہ تلملا اٹھی لیکن مرتی کیا نہ کرتی کہ اندر ہی اندر وہ بھی سلیم میں سما چکی تھی۔ سلیم سے الگ اس کا کوئی وجود باقی کہاں تھا کہ اس کی جدائی کی سوچ ہی اسے نیم جاں کر دیتی۔

تب رئیس الدین کے اندر اکبرِ اعظم کا سا جاہ و جلال امنڈ آیا کہ وہ ایک بار پھر سلیم کی انارکلی کو دیواروں میں چن دینا چاہتے تھے لیکن شہنشاہی عظمت والے رئیس الدین کے پر توقانون نے کتر ڈالے تھے۔ سلیم قانون کا سہارا لیکر بلوغیت کا سرٹیفکیٹ پیش کرنے لگا۔ سیرت پر اپنی قانونی حقِ ملکیت جتانے لگا۔ سلیم قانون کی موٹی موٹی کتابوں کے حوالے سے سیرت کو اپنی تحویل میں لینے کی عرضی پیش کرنے لگا۔

رئیس الدین گھبرا گئے۔ رات بھر سوچتے رہے کہ وہ اس انارکلی کو دیواروں میں چن دیں یا راتوں رات کہیں کسی کے پلّے باندھ دیں کہ اپنے خاندانی وقار پر آنچ آئے کبھی وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایک غریب مزدور کے ساتھ راتوں رات سیرت بیاہ دی گئی۔ سلیم کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ تلملا اٹھا۔ وہ اپنی شکست ماننے کو کبھی تیار نہ تھا۔ فوراً ہی اپنے نوٹوں کی تھیلی کھول دی اور پھر قاصدوں نے سیرت کو ڈھونڈ ہی نکالا۔

سیرت اسی کے کارخانے کے ایک ادنیٰ غریب مزدور کے سر منڈھ دی گئی تھی۔ سلیم وقت کی نزاکت کو بھانپ کر کچھ دنوں کے لئے خاموش رہا لیکن گھات لگائے بیٹھا رہا کہ کس طرح کمزور مزدور کے ہاتھوں سے سیرت کو چھین لائے۔

سیرت صبر کے دامن میں آنسوؤں کی طرح اپنے آپ کو جذب کر کے اپنے مجازی خدا کی پرستش میں لگ گئی۔ خاوند کی خوشی ہی اب اس کی اپنی خوشی تھی لیکن سلیم اندر ہی اندر انار کلی کی بدلی ہوئی صورت مہرو پر قابض ہونا ہی اپنا مقدر سمجھتا تھا۔

تب شیر افگن کی موت اس کے سامنے ننگے پاؤں رقص کرتی نظر آئی۔ سلیم اپنی محبت پر باپ کی بے جا دخل سے پاگل ہوا جا رہا تھا اسے انار کلی اور مہرو ایک ہی دکھ رہی تھی جب تک سیرت اس کے گھر تھی وہ اسے انار کلی ہی تصور کرتا رہا لیکن بیاہ دیئے جانے کے بعد وہ اسے مہرو کی صورت میں ڈھلتی محسوس ہو رہی تھی جس کے حصول کیلئے شیر افگن کی موت لازمی تھی۔

اور ایک دن مشینوں کا سہارا لیکر کمزور اور بے بس مزدور کو حادثے کی نذر کر دیا گیا۔ سلیم اپنی اس شاطرانہ چال پر نازاں تھا کہ اب مہرو یعنی سیرت پر اس کا صرف اس کا قبضہ ہوگا۔ لیکن سیرت اپنے بے وقت کی بیوگی پر قدرت سے کم سلیم سے زیادہ خفا تھی کہ اس کی جنونی کیفیت سے وہ کم و بیش آگاہ تھی۔

"تو کیا سیرت، سلیم کی نہیں بن سکی" کسی نے سوال کیا۔

نہیں! سلیم آجتک اپنی غلطی پر شرمندہ، ان قافلوں کے درمیان بھٹکتا پھر رہا ہے اور اپنی محبت کی ڈیڑھ منزلہ عمارت کو اپنے نحیف و کمزور اور ضعیف کاندھے پر ڈھوئے ڈھوئے پھر رہا ہے۔

"تو پھر سیرت کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے" قافلہ میں شامل ایک ضعیف شخص نے پوچھا۔

"سیرت یہاں ہے" ـــــ درمیان سے ایک سن رسیدہ خاتون نے اٹھ کر قصہ گو پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ـــــ ایسا لگا کہ نگاہوں سے ہی اسکی تن سے من کے اندر تک اتر جانا چاہتی ہو۔ اور پھر آگے کی اور بڑھ گئی۔

قصہ گو بھی ہلکے ہلکے قدموں سے اسکی اور بڑھتا رہا۔

آگے پیچھے بڑھتے ہوئے سلیم اور سیرت اب بھی صرف ایک دوسرے کی دید کے لئے قافلوں کے ساتھ ساتھ بھٹک رہے ہیں۔ ●●

بے نور آنکھیں

حلیمن کی آنکھوں سے پانی کا بہنا بدستور جاری تھا۔ اس طرح جب ڈھیر سارا پانی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتا تو بیمار آنکھوں کی روشنی اور دھندلا جاتی تب وہ اپنی آنکھوں کی عنابی مچھلیوں کی تڑپ کو سینے پر محسوس کرتی۔ سینے کے بوجھ سے سارا جسم لرز اٹھتا اور پھر سامنے کی صاف ستھری روشنی پر جیسے دھواں سا چھا جاتا۔ اس وقت وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ اس کی بند آنکھوں کی تاریک دنیا میں اس کا اپنا نورالعین صاف اور روشن نظر آتا۔

گال گلابی، بال لمبے لمبے، ہونٹوں پر سرخی، آنکھوں میں کاجل، کانوں میں بالی اور پیشانی پر دمکتی سنہری بندیا اور ان سب کے درمیان اس کا نصف مردانہ، نصف زنانہ چہرہ یعنی زنانہ نقش و نگار پر مردانہ پن کی سختی، نورعین سے نورعینی میں تبدیل ہوتا چہرہ۔

آج وہی چہرہ ہر محفل کی جان تصور کیا جاتا۔ چاہے وہ زچگی کے موقعہ پر بدھائی گیت کی محفل ہو یا شادی کی تقریب پر مبارک باد کی محفل، ہر

جگہ عینی کی نصف زنانی صورت کی دمک سے حاضرین پر مستی چھا جاتی کہ عینی پوری ٹولی میں سب سے زیادہ تیز ناچنے والی تھی۔

خوش شکل، تیکھے خدوخال اور صاف رنگ کا عینی بارہ برس کا ہوگا جب وہ اپنے باپا کا گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اس ٹولی میں شامل ہوا تھا۔

اس وقت حلیمن کا عروج تھا کھنکتے سکوں کی طرح اس کا بازار گرم تھا چست سیڈول جسم کی مالہ تھی بس ذرا ہونٹ موٹے تھے اور رنگ قدرے سیاہ۔ مگر اپنے دھندے میں بڑی مشاق تھی۔ اس کا بھونڈے پن سے ناچنا، بے ہودہ مذاق کرنا، اپنی چوڑی ہتھیلیاں نچا کر بلا جھجک بنا ــــــ نوجوانوں کو خوب بھاتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نوجوانوں کی محفل میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی اور نوجوانوں کی چھیڑ چھاڑ پر حلیمن کو بھی بڑا لطف ملتا۔ اس وقت وہ زمین سے ایک ہاتھ اوپر اٹھ جاتی جہاں وہ ٹخنوں تک اپنا لہنگا اٹھاتے نہیں جھجکتی۔

حلیمن اپنی ٹولی کی سردار تھی۔ اپنے کنبے پر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی ہر کوئی اس کے حکم کا پابند ہوتا اس کی مرضی کے خلاف کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

یوں تو حلیمن کنبے کے ہر فرد کو ایک نظر سے دیکھتی لیکن عینی کے لئے اس کے دل میں ایک عجیب سی تڑپ رہتی اس کے اس نرم گوشے سے عینی بھی خوب واقف تھی۔ شاید اسی لئے عینی بھی حلیمن کی بڑی عزت کرتی۔ وہ موسی کی تعریفیں کرتے کبھی نہیں تھکتی۔ ایسا لگتا کہ جیسے سگی موسی ہی ہو۔ اپنی کمائی کا پورا حصہ حلیمن کے قدموں میں لاکر ڈال دیتی۔ وقت ضرورت جو طلب کرتی اسے مل جاتا ویسے اس کی ضرورت بھی کیا تھی ساری ضرورتیں تو حلیمن موسی ہی پورا کر دیتی۔

حلیمن کو آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب عینی پہلی بار اسکی گود میں سر رکھ کر زار و قطار روئی تھی۔ اس روز وہ ایک بچے کے منہ جھوٹائی کی تقریب سے

لوٹ رہی تھی۔ راستے میں زور کی بارش ہو گئی وہ بمشکل تمام بھیگتے بھاگتے پلیٹ فارم پر پہنچی۔ اس وقت تک بارش چھوٹ چکی تھی۔ سورج کی سنہری کرنوں سے پلیٹ فارم کا کولتار دمک رہا تھا۔ اسی دمکتی روشنی میں اسے پلیٹ فارم کے آخری سرے پر الکٹرک پول سے ٹیک لگائے ایک نسوانی خدوخال کا لڑکا نظر آیا۔ درمیانہ قد، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں میں کاجل کی موٹی لکیر، گردن میں سرخ رنگ کا اسکارف لپیٹے کسی گہری سوچ میں غرق تھا کہ اچانک اسکی نظر حلیمن سے چار ہو گئی۔

"ہائے خالہ" کہہ کر وہ کمر لچکاتی اور ہاتھ مٹکاتی ہوئی حلیمن کی طرف بڑھ آیا۔

"کاہے بہین؟" حلیمن سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"بہین نہیں موسی، بیٹی بول بیٹی"۔ وہ ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے لچک کر بولی۔

"ہائے نصیبہ پھوٹے، میری بیٹی بنے گی۔" حلیمن کو نخرے کی سوجھی وہ اٹھلا کر بولی۔

"نصیب پر تو سات تبرات، کی کالک پہلے سے ہی پڑی ہے موسی"۔ اس نے لہک کر کہا اور پھر حلیمن کے دامن کو پکڑ کر زاروقطار رونے لگی۔

روتی رہی تقریباً نصف گھنٹے کے بعد سسکیوں سے جب باہر نکلی تو حلیمن کو وہ آنسو میں ڈوبی فلمی اسٹیج سے بھاگی ہوئی کوئی کردار لگی۔ نہیں چاہتے ہوئے بھی حلیمن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب وہ بھیگے کپڑے کی طرح حلیمن سے چمٹ گئی۔

اس دن لاکھ پوچھنے پر بھی وہ پوری طرح کھل نہیں سکی۔ صرف اتنا ہی بتا پائی کہ ــــــ وہ اپنے شرابی باپ کے مسلسل کی بے پناہ اذیتوں سے سکڑ سی گئی ہے اور پھر سوتیلی ماں کے تیز و تند طعنے نے اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ آخر وہ کب تک ان اذیتوں اور طعنوں کے کانٹوں کے درمیان جھولتی رہتی کہ فرار تو اس کا مقدر بن گیا تھا۔

اسی وقت حلیمن اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی اور اسکی ساری ذمہ داری اپنے نحیف کاندھے پر اٹھائی۔ اس پر اپنی بیکراں شفقت نچھاور کرتی رہی۔ ہمدردی اور

چاہت اندیلتی رہی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ حلیمن پر پوری طرح کھلتی چلی گئی۔ جسے حلیمن بھی نہایت احتیاط اور سنجیدگی سے اپنے دامن میں سمیٹتی چلی گئی۔

حلیمن کی آنکھوں کی تکلیف دن بدن بڑھتی جا رہی تھی لیکن وہ اپنی تکلیف کو عینی پر ظاہر ہونے نہیں دینا چاہتی تھی کہ عینی کی بندشیں اس پر بڑھ جاتیں اور پھر عینی خواہ مخواہ اداس ہو جاتی اسے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ جب وہ پہلی بار ناچتے ناچتے اچانک فرش پر لڑھک گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے یکایک اندھیرا چھا گیا تھا۔ سارے منظر جیسے دھند میں لپٹ گئے ہوں اسوقت عینی اگر ساتھ نہ ہوتی تو وہ آج شاید زندہ نہیں ہوتی۔ کچے آنگن کے اوبڑکھابڑ زمین پر اس کے پاؤں پھسل گئے تھے۔ وہ تو عینی نے بڑھ کر سہارا دیا ورنہ سامنے پڑے پتھر سے اس کا سر چور چور ہو گیا ہوتا ـــــ اور پھر عینی سے زیادہ درد کس نے محسوس کیا تھا۔ وہ فوراً محفل چھوڑ کر اس کی خدمت میں لگ گئی تھی۔ بیچاری ہفتوں تیمارداری کرتی رہی۔

اس حادثے کے بعد عینی اب اسے کسی رقص میں جانے کی اجازت نہیں دیتی عینی کی شدید محبت تھی جو حلیمن پر وہ بچھی چلی جا رہی تھی۔

حلیمن اب اپنے دھندے سے بالکل الگ سی رہتی بس ٹولی کے سربراہ ہونے کے ناطے محفل میں شریک رہتی کہ اب اس کی ساری ذمہ داری عینی نے سنبھال لی تھی۔ نرم گرم تمام فیصلے عینی ہی کرتی۔ بس حلیمن موسی صرف ہاں میں ہاں ملاتی۔ عینی کو تو بس موسی کی فکر رہتی کہ ان کے دماغ اور آنکھ پر کوئی بوجھ نہ رہے۔ برابر تاکید کرتی رہتی۔

"موسی! آنکھوں میں دوا ڈالا؟ سویرے اور شام پابندی سے دوا نہیں لوگی تو روشنی کیوں کر آئے گی؟"

"عینی" ـــــ موسی چیختی ـــــ "اس موئے آنکھ میں روشنی کی اب کیا ضرورت ـــــ میری آنکھیں تو اب تو ہے تیری آنکھوں سے کام چلا لوں گی۔"

"موسی ـــــ دنیا اپنی ہی آنکھوں سے بھلی لگتی ہے پرائے تو سوئی ہی چبھوئیں گے۔"

"لیکن تو تو پرائی نہیں، تیرے نین ہمیشہ روشن رہیں اور مجھے کیا چاہیے۔"

حلیمن کی لاپرواہی سے اس کی بینائی دن بدن گھٹتی جارہی تھی ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ بڑے شہر میں ہی اس کا آپریشن ممکن ہے اور اس کے لئے کثیر رقم کی بھی ضرورت ہوگی۔

عینی اکثر سوچتی کہ اگر موسی کی آنکھوں کا آپریشن وقت پر نہیں ہوا تو بینائی جاتی رہے گی۔ عینی اپنی موسی کے لئے جسم وجان تک گروی رکھنے کو تیار تھی شاید اسی لئے اپنی جان کی مطلق فکر نہ کر کے صبح سے شام تک اس گاؤں سے اُس گاؤں، اس شہر سے اس شہر، اس کالونی سے اس کالونی کا چکر لگاتی رہتی۔ روز کہیں نہ کہیں پروگرام کر ہی لیتی۔ اسے تو بس اپنی موسی کے آپریشن کیلئے روپے اکٹھے کرنے تھے۔ اسی دوران اسے اس روز ایک نئے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔

وہ محو رقص تھی۔ بدھائی کی محفل تھی۔ سبھی لوگ تھرک رہے تھے۔ ڈھولکئے کی تھاپ پر عینی کی کمر کچھ زیادہ ہی لچک رہی تھی۔ ہفتوں کی مصروفیت کے باوجود اس کے پاؤں میں بجلی کی سی چمک تھی اسے تو موسی کیلئے ناچنا تھا۔ زبان پر ترنگ، بدن میں چمک اور ہاتھوں میں برقی لہر تھی اور آنکھوں میں عجیب سی قوت۔ وہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو نچا نچا کر حاضرین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی اور پھر سبھی یک زبان ہو کر گنگنانے لگتے ——

" بدھائی ہو بدھائی —— رام جی نے کیا جوڑی بنائی۔

واہ واہ رام جی، جوڑی کیا بنائی۔

بھیا اور بھابھی کو بدھائی ہو بدھائی "،

درمیان میں عینی کی آواز گونجی۔

" واہ واہ رام جی ——

دیدی اور بھیا کو بدھائی ہو بدھائی "۔

اچانک ناچتے ناچتے عینی کے پاؤں رک گئے —— آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔

جسم کی لچک اور تھرک یک لخت پتھر کی طرح بے جان ہو کر رہ گئی اور تب ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز گونجی۔

عینی نے ایک نوعمر بچے کے سُرخ سُرخ ٹماٹر جیسے گال پر ایک بھرپور تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ فضا میں خاموشی چھا گئی جیسے اچانک دھارا ایک سو چوالیس کا سرکاری حکم نافذ ہو گیا ہو۔ سبھوں پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ میزبان کے نوخیز بچے پر ایک بدذات گانے ناچنے والی کے تھپڑ کی گونج ساری فضا میں پھیل گئی۔

وہ تو اچھا ہوا صاحبِ خانہ اس وقت موجود نہ تھا۔

ورنہ قیامت برپا ہو جاتی۔

عورتوں نے عینی کو لعن طعن کر کے دروازے سے باہر نکال دیا۔

"عینی تجھے ایسا نہیں کرنا تھا۔" موسی نے سمجھایا۔

"نہیں موسی، مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔"

______ اس چھوٹے سے چھوکرے کا پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ناچنا ______ تھرکنا ______، اور پھر اس کی آنکھوں میں جو چمک میں نے دیکھی ______ اس پر میرا یہ ضرب لگانا ضروری تھا۔

کاش ایسا ہی تھپڑ اس وقت مجھے کسی نے لگایا ہوتا۔ جب پہلی بار طبلے کی تھاپ پر میری کمر لچکی تھی اور میں نے آپے سے باہر ہو کر اپنے پیروں میں گھنگھرو ڈال لیے تھے۔

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے موسی!

گھر کے آنگن میں کسی کی شادی تھی۔

رات جگے کا پروگرام تھا۔

گھر کی عورتیں بیٹھیں آٹے کے گلگلے بنا رہی تھیں

اور پاس پڑوس کی عورتیں طبلے کی تھاپ پر فلمی گیت گا رہی تھیں۔

'دلہے راجا آئیں گے

تو لیں گے ہم بلائیں

بنی رہے جوڑی

راجا رانی کی جوڑی رے

دلہے راجا آئیں گے

تو لیں گے ہم بلائیں'

میں بھی اٹکھیلیاں کرتے اس محفل میں شریک ہو گئی اور بھونڈے پن سے اپنی کمر کو ساری رات اِدھر اُدھر مٹکاتی رہی۔ کبھی کسی کا دوپٹہ اوڑھ لیتی تو کبھی کسی کی بلائیں لیکر اپنی انگلیاں چٹخا لیتی۔ دور سے لطف لیتی ہوئی عورتیں کھل کھلا کر ہنس پڑتیں تو قریب بیٹھی منچلی عورتیں اپنی باہوں میں بھینچ لیتیں۔

صبح ہوتے ہوتے سارے علاقے میں میرے ناچ کی خبر پھیل گئی۔

پھر کیا تھا سر پھرے نوجوانوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اور دوستوں کی محفل میں میری آؤ بھگت بڑھ گئی۔ ہر کوئی مجھ سے کھیلنے لگا۔ قریبی دوستوں نے میری چٹکی لینی شروع کر دی۔ کوئی چوتڑ پر چٹکی لیتا تو کوئی گورے گالوں پر۔ بعض منچلے دوست تو اپنی گود میں بھی مجھے بٹھانے سے نہیں ہچکچکتے تھے۔

مدتوں میں اپنے نصف مردانہ، نصف زنانہ، وجود کے درمیان جھولتا رہا۔ باہر دوستوں سے ڈرتا اور گھر میں پاپا اور ممی کے طعنوں سے ــــــ۔

اس دن تو حد ہو گئی ــــــ

جب چند شر پسند میری عزت پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے تو خوب نچایا۔ پھر کچھ پلایا اور جب میرے قدم بہکنے لگے تو وہ لوگ چیل کی طرح مجھ پر

جھپٹ پڑے۔ اس دن میں وہاں سے جو بھاگی تو آپ کی گود میں ہی پناہ لی۔"

حلیمی کی آنکھوں سے پانی کا بہنا بدستور جاری تھا۔ اس طرح جب ڈھیر سارا پانی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تو اس کی آنکھوں کی روشنی کچھ زیادہ ہی دھندلا گئی۔

تب وہ اپنی آنکھوں کی عنابی مچھلیوں کی تڑپ کو سینے پر محسوس کرنے لگی۔ سینے کے بوجھ سے سارا جسم لرز اٹھا اور پھر سامنے صاف ستھری روشنی پر جیسے دھواں سا بھر گیا ــــــ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لیکن اس کی بند آنکھوں میں بھی نورالعین کے روشن فیصلے کی دمک صاف نظر آ رہی تھی۔

●●

بے ثمر حیات

میں اپنی قبر کے سرہانے کھڑا اپنی مغفرت کی دعا کر رہا تھا ــــ دانستہ و غیر دانستہ خطاؤں کی بخششیں مانگ رہا تھا ــــ اور زار و قطار روئے جا رہا تھا ــــ آنکھیں تر بتر تھیں ایسا لگتا تھا کہ جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے بہہ نکلے گا ــــ کہ اچانک ایک شناسا چہرہ سامنے آ گیا ــــ اس نے مجھے ٹوکا۔

"کیا کر رہے ہو ــــ فاتحہ تو پڑھ چکے ــــ اب چلو بھی۔"

"کہاں؟"

"گھر"

"گھر ــــ! کونسا گھر، میرا گھر تو یہی قبر کی گود ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا ــــ تمہاری رہائش گاہ تو وہ سفید پتھروں سے چنا ہوا عالیشان محل ہے ــــ تمہاری جانفشانیوں کی بولتی تصویر۔"

"تصویر، تصویر تو ہمیشہ خاموش ہوا کرتی ہے۔"

"اسی لئے تم خاموشی میں اتر جانا چاہتے ہو۔"

"ہاں! اب میری کیفیت فریم میں منڈھی ہوئی حرکات و سکنات سے محروم اس تصویر سے کچھ الگ نہیں۔"

"تمہارے دماغ میں یہ الٹی سیدھی باتیں کیسے نصب ہوگئیں؟"

"نصب، ہاں نصب ـــــ دیکھتے نہیں میری قبر پر نصب میرے نام کی تختی، اسی نے میرے دماغ کی رگیں ڈھیلی کر دی ہیں۔ یہ کتبہ ہی تو میرے بے جان ہونے کی دلیل ہے۔ اب تو یہ خاک ہی تکیہ اور خاک ہی بچھونا ہے۔"

لیکن میرے شناسا نے میری ایک نہ سنی ـــــ وہ مجھے نیم پاگل اور سنکی تصوّر کرتا رہا اور پھر وہ میرے مردہ جسم کو لوہے کے اس فولادی اور قد آور گیٹ کے اندر ڈھکیل کر یہ کہتا ہوا نہ جانے کہاں گم ہوگیا ـــ کہ ـــ "یہ تمہاری قیام گاہ ہے۔"

اسے کیا معلوم کہ یہ میری عارضی رہائش گاہ کبھی مستقل قیام گاہ نہیں بن سکتی ـــــ انسان تو مٹی کا پتلا ہے ـــــ اور مٹی کا پتلا ـــــ بس اپنے خالق کے ہاتھوں بنتا اور بگڑتا رہا ہے۔ مٹی کے پتلے کو دنیا کی میٹھی آنچ میں تپا کر ہی اس کا خالق ایک دن خود اس کو تڑخنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شائد فنا ہونا ہی اس کا مقدر ہوتا ہے۔

میں جب اندر داخل ہو ہی چکا تھا تو خیال آیا کہ ایک بار بھولی بسری یادوں کو تازہ کر لوں ـــــ یہ سوچ کر ایک طائرانہ نگاہ اپنی محنت و جانفشانیوں سے چنی ہوئی عمارت پر ڈالی ـــــ ایسا گمان گزرا کہ اوپر، بہت اوپر، منڈیر پر کوئی چیل بیٹھی ہے اور سامنے دربان بھی اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا ـــــ میں دالان سے ہوتا ہوا صحن کے چوڑے چکلے سینے پر اتر آیا ـــــ سوھرتی کو گدگدی سی ہوئی پر انگڑائی لے کر رہ گئی ـــــ صحن کے چاروں اور لاپرواہی کے چند گھاس اُگ آئے تھے۔ ویران ویران سا، خاموش صحن، رات کے دھندلکے کو نگلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

بچے شاید اپنے اپنے کمروں میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ بچوں کا کیا، ان کے مستقبل کی باگ ڈور تو والدین کے نحیف و ناتواں ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے ـــــ بچہ تو بس مٹی کا تودہ ہے ـــــ وہ تودہ، جو اپنے کمہار کے ہاتھوں بننے، سنورنے اور پکنے پر ہی نکھرتا ہے۔

بچہ کو سوتا چھوڑ کر میں آگے بڑھ آیا ـــــ اپنی آرام گاہ کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹھک سا گیا ـــــ دروازہ کھلا تھا ـــــ چند لمحے سوچتا رہا کہ میری شریکِ حیات مجھے دوبارہ دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔ وہ چہک اٹھے گی ـــــ اس کی امنگیں ایک بار پھر جوان ہو اٹھیں گیں ـــــ وہ میرے چوڑے چکلے سینے سے چمٹ کر خوب روئے گی اور پھر جنم جنم جدا نہ ہونے کی قسمیں لے گی ـــــ اور پھر ـــــ میری قربت کی بھینی بھینی خوشبو میں اتر کر نہال ہو جائے گی۔ سونی مانگیں یکبارگی سرخ دکھنے لگیں گی۔ سفید کپڑوں پر امنگوں کی رنگین لہریں ابھر آئیں گی ـــــ فضا ایک بار پھر معطر ہو اٹھے گی۔ یہ سوچ سوچ کر ہی میری آنکھیں بھیک گیئں۔

میں اپنے دامن سے آنسو خشک کرتا، اس کے کمرے میں، نہیں اپنے کمرے میں اتر آیا ـــــ کمرہ تنگ و تاریک نظر آرہا تھا۔ بیگم ریڈنگ ٹیبل پر جھکی لیمپ کی سمٹی ہوئی روشنی میں اپنی کسی سہیلی کو شاید خط لکھ رہی تھی ـــــ میں نے دبے قدموں، پیچھے سے، اسکی آنکھوں پر اپنی سخت و مضبوط انگلیاں رکھ دیں کہ شاید ان ہاتھوں کے لمس کو وہ محسوس کرکے ہی چونک اٹھے اور پھر اپنی شناخت پیش کرنے کی مجھے ضرورت ہی نہ پڑے۔

"کون؟ ـــــ یہ کیا بدتمیزی ہے" قدرے خفگی کے ساتھ بولی۔ اور پھر جھٹکے کیساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے پلو کو درست کیا اور پھر اپنے نیم عریاں جسم کو ڈھانپتے ہوئے مجھ پر تقریباً برس ہی پڑتی کہ میری معصوم صورت پر شاید ترس کھا گئی۔

"آپ کون ہیں؟"

"بیگم! میں تمہارا خاوند ہوں۔"

"میرا خاوند ـــــ دماغ تو ٹھکانے ہے ـــــ ان کو مرے ہوئے تو مہینوں بیت گئے۔ میں نہ سہی ـــــ گھر کے بڑے بزرگ انہیں منوں مٹی کے نیچے دفن کر آئے ہیں۔"

"بیگم میرا یقین کرو ـــــ میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ میں مر چکا ہوں پر میرے ایک شناسا نے مجھے احساس دلایا کہ ـــــ میں زندہ ہوں اور پھر وہی مجھے تمہارے پاس چھوڑ گیا ہے۔"

"وہ لغو بکتا ہے ـــــ مر کر بھی آپ جیسے لوگ کہیں جیتے ہیں۔"

"میں بھی جانتا ہوں، موت برحق ہے اور مر کر انسان فنا ہو جاتا ہے لیکن یقین مانو، میں ابھی فنا نہیں ہوا ـــــ میرے جسم میں سوئی چبھو کر دیکھ لو ـــــ"

"کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ جیتے جی تو جینے نہیں دیا ـــ اب مر کر بھی چین سے رہنے نہیں دیں گے ـــــ کل تک تو آپ کی ہر بات مانتی رہی ـــــ دن کو رات، تو سرخ کو سیاہ کہلواتے رہے، میں کہتی رہی ـــــ جس رنگ میں آپ نے چاہا، میں ڈھلتی رہی ـــــ پر اب خدارا مجھ پر ترس کھائیے ـــ اب تو اپنی مرضی سے جینے دیجئے ـــــ ایک مدت کے بعد تو آزادی ملی ہے اسے بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ قیدی پرندے کی طرح پنجرے میں سسک سسک کر جی رہی تھی پھر بھی چہرے پر الم کے آثار نمایاں ہونے نہیں دیا ـــ للہ مجھے تو آزادی اور خود مختاری کی فضا میں سانس لینے دیجئے۔"

میں مر کر جیسا تھا اس لئے دوبارہ مرنا نہیں چاہتا تھا پر مرتا کیا نہ کرتا ـــ ہلکے قدموں، وہاں سے کھسک آیا۔ سوچا ـــ چلو اپنا کاروبار ہی دیکھ لوں۔ شاید وہاں نائٹ شفٹ چل رہی ہو گی۔

دفتر پہنچتے ہی میرے قدم یکبارگی رک گئے۔ یہ کیا ــــ سب لوگ سو رہے ہیں کیا۔ اب رات کا کام بند ہو گیا ہے ــــ رات کی تاریکی میں ہی تو کاروباری، سونے کے انڈے اباتے ہیں۔ انہیں تاریک راتوں سے ہی تو دن کی سفیدی پھوٹتی ہے۔ رات جتنی بھیانک ہو گی دن اتنا ہی روشن ہو گا۔

لیکن یہاں تو رات کے اندھیرے پر خاموشی کی دبیز چادر تنی تھی۔ دفتر کی بعض میزیں تو بالکل خالی پڑی تھیں۔ اکا دکا لوگ جو موجود تھے وہ بھی اونگھ رہے تھے ــــ میں گھبرا کر سیدھا اپنے کیبن میں گھس آیا ــــ۔

اپنی کرسی پر اپنے چھوٹے بھائی اَمّو کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ صبح کا بھولا شام کو اگر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے ــــ کل تک دفتر کی سیڑھیوں سے بھی نفرت کرنے والا ــــ آج کس چاہ سے رات گئے تک دفتر کی کرسی پر بیٹھا، کاروباری پیچیدگیوں میں گم ہے۔ تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی۔

میں اپنا کاندھا ایک ہلکا محسوس کرنے لگا۔ ایسا گماں ہوا کہ میرے بازو سے منسلک کاندھے کا بوجھ کسی نے اچانک بانٹ لیا ہو۔

"بھیا، آپ ــــ" وہ مجھے دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "لیکن آپ تو مر چکے ہیں ــــ کیا دنیا کی موہ آپ کو پھر یہ کھینچ لائی، انسان اس فریبی اور مطلبی دنیا سے بچنا چاہتا ہے۔ اور آپ اس حریص دنیا کے مایا جالے میں دوبارہ لوٹ آئے۔"

"میرے بھائی تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو، میرا سفر ابھی جاری و ساری ہے۔" میں نے وضاحت کرنی چاہی۔

"بھیا ــــ آپ بزرگ ہیں اسلئے احترام کر رہا ہوں ورنہ ...." وہ آپے سے باہر ہوتا ہوا نظر آیا۔

"ورنہ کیا ــــ" میں نے بھی بات کی کھال اتارنی شروع کر دی۔

"بھیا ــــ آپ مر چکے ہیں ــــ آپ کو یہ سب شوبھا نہیں دیتا ــــ"

وہ الم غلم بکے جا رہا تھا۔

"میرے بھائی! یہ میرا دفتر ہے یہ سارا کاروبار میرا ہے۔ یہاں کی ہر چیز میری ہے دیکھو ـــــ اسے سونگھو ـــــ اسمیں اب بھی میرے پسینے کی بو تمہیں ملے گی ـــــ" میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "آپ کا ـــــ" وہ ہنسا ـــ پھر غصّے میں اکڑ کر بولا ـــــ "کل تک جب آپ زندہ تھے شاید آپ کا تھا پر آج آپ مر چکے ہیں۔ اس پر آپ کا کوئی حق نہیں ـــــ یہاں کی ہر چیز آپ کے لئے پرائی ہے اور اب ان سب پر میرا حق ہے میں یہاں کا مالک ہوں"۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو ـــ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میں نے کتنی جانفشانیوں سے، دن رات ایک کر کے، اپنے خون سے اسے سینچا ہے اور اس قابل بنایا کہ گھر کا ہر فرد خوش و خرم رہ سکے ـــــ" میں نے تفصیل بتائی۔

"آپ اپنی عاقبت کیوں بگاڑ رہے ہیں ـــ جایئے قبر کی تاریک گوشے میں اپنی مغفرت کی دعا کیجئے ـــ" اس نے صلاح دی۔ "تم کیا بکتے ہو ـــ مجھے بے دخل کر رہے ہو تمہارا اس کاروبار میں کیا حق، میری کرسی چھوڑو"۔ میں نے طیش میں آکر کہا۔

"بھیا ـــ آپ کا دماغ چل گیا ہے ـــــ اس طرح بھی کوئی مر کر لوٹتا ہے اپنوں کی پھلتی پھولتی زندگی کیلئے ہمیشہ بزرگوں نے اپنی آنکھیں زبردستی موندلیں ہیں آپ بھی اپنی آنکھیں موند لیجئے ـــ اور رب کا نام لیجئے ـــ شاید مغفرت مل جائے۔" اس نے مشورہ دیتے ہوئے مزید کہا۔

"آپ کو نہیں معلوم، انسان کا تعلق بس اسکی سانسوں سے ہے۔ سانس اکھڑی نہ بس ـــــ، اسکی زندگی اُکھڑ گئی۔ منٹوں منٹوں میں ہی بادشاہوں کے زرق برق لبادے اتار کر اسے پر سفیدی مل دی گئی ہے۔ آپ کیا ـــ آپکی بساط کیا ـــ کہ ہمیشہ قائم رہیں"۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جایئے ورنہ خواہ مخواہ لوگ جمع ہو جائیں گے اور پھر دوبارہ آپکو قبر کی تاریکی میں اتار کر سینے پر منوں مٹی لا رکھ دینگے۔

اس کی بات میرے دل میں اتر آئی ـــــ شاید اسی لئے میں دوبارہ قبر میں اتر آیا ـــ اور میرا وہ شناسا میری قبر ـــ میرے نام کی تختی کی قبر کے سرہانے کھڑا رب العزت سے میری مغفرت کی دعا مانگ رہا تھا ـــ کہ شاید اُسے بھی اب میرے مرنے کا یقین آگیا تھا۔ ●●

"خداوند کے فرشتے نے اُسے خواب میں دکھائی دیکر کہا۔ اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔" ٥ [متی کی انجیل ــــ انجیل مقدس سے ــــ ٢١]

اس پر غشی سی طاری تھی، اور وہ غنودگی کی حالت میں الم غلم بکے جا رہی تھی ـــــ۔ خواب آور دوا کی پوری شیشی نلکیوں کے ذریعہ اس کے جسم میں اتار دی گئی تھی ـــــ پر وقفے وقفے سے جب اسکی خواب آور آنکھیں کھلتیں تو سرخ سرخ خون برساتی نظر آتیں اور حلق میں پڑی زبان خوف و ہراس سے رندھ سی جاتی اور وہ رندھی ہوئی آواز میں ہی کچھ بڑبڑاتی۔

ڈاکٹر ساری رات اس کے نیم مردہ جسم کے تار کو چھیڑتے رہے تاکہ جسم کی گرمی برقرار رہے ـــــ۔

جب کبھی آنکھیں کھلتیں تو وہ اپنی ادھوری شناخت ہی بیان کر

پاتی کہ پھر غشی کی بے جان گود میں لڑھک جاتی ——۔

"میں مریم ہوں —— میں اپنی چودہ پشتوں یا چودہ ہزار پشتوں سے جڑی ہوں۔ آسمان نے کہا —— میں تمہیں اپنی ضرورتوں کے لئے جن صورتوں میں، جب چاہوں فرش پر اُگل سکتا ہوں"۔

اور بس، وہ پھر غنودگی کی آغوش میں چپک جاتی۔

دن شاید پوری طرح چڑھ آیا تھا —— اس لئے اس کا اپنا سایہ بھی چھوٹا دکھنے لگا۔ سائے کا کیا وہ تو سورج کے ہاتھوں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اپنے مقدر سے نہ جی سکتا ہے نہ مر سکتا ——

سایہ کے چھوٹا ہوتے ہی اس کا قد بھی کوتاہ ہو کر رہ گیا تھا۔ تب وہ اپنے بونے قد سے بھاگتی ہوئی قد آور شیشے سے جا ٹکراتی۔ اب وہ دراز قد شیشے کے سامنے برہنہ تھی —— ہر زاویے سے وہ کھلی کتاب دکھ رہی تھی —— شیشے نے تو جھوٹ نہ بولنے کی قسم روزِ اول سے ہی کھا رکھی تھی۔

شیشے کے سامنے اس کے جسم کا پور پور ڈھیلا پڑ گیا، اس کے تیکھے خدوخال کی کڑوی کسیلی صورت نمایاں طور پر سامنے دکھائی دے رہی تھی —— چہرے کے سپاٹ بے رونق تکونے زاویے پر کالے تل کی سیاہی سے وہ تلملا اٹھی۔ گھبرا کر چہرے کے کھردرے زاویے سے نیچے اتر آئی —— پر پیٹ کی بے تکی گولائی اور اونچائی پر اس کی آنکھیں ٹک سی گئیں۔ یہ ہمالہ سے باتیں کرتی ہوئی —— فلک بوس عمارت لگ رہی تھی۔ اب اس کو فرش پر گرانا ممکن نہیں ——۔

"ڈاکٹر" وہ تقریباً چیخ کر بولی —— "میرے یوسف کو کہیں سے ڈھونڈ لائیے —— میرے جسم میں روح القدس کی گواہی کے لئے اس کا ہونا لازمی ہے۔ میں ان کی ہوں اور وہ میرے ہیں —— وہ خوشی سے مجھے گلے لگا لیں گے"۔

"سسٹر (Sister)! خون کی ضرورت پڑے گی اور آکسیجن بھی

تیار رکھنا۔" ڈاکٹر ہدایت کی فہرست نرس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹروں کی ایک مکمل ٹیم حرکت میں آ گئی ـــــ مریضہ کی حالت تشویش ناک بتائی گئی تھی ـــــ۔

پر آپریشن کے ضمانتی پرزے پر دستخط کیلئے مزدور تیار نہ تھا ـــــ۔

"میں مزدور ہوں روز کماتا روز کھاتا ہوں ـــــ آج روزی کے لئے نکلا تو راستے میں یہ مل گئی اس کی زبوں حالی دیکھ کر اسے یہاں لے آیا کہ شاید مسیحاؤں کی اس نگری میں اس کی جان بچ جائے ـــــ پر یہاں تو میری جان کے لالے پڑ گئے ہیں آپ لوگوں سے زیادہ مجھے ہی اس کا ضامن بننا پڑ رہا ہے۔"

"ڈاکٹر ـــــ" نرس دوڑی دوڑی ہانپتی کانپتی آئی اور بولی ـــــ

"مریضہ کو ہوش آگیا ہے۔"

"تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو۔" ڈاکٹر نے تفتیش شروع کی۔

"میں ابراہام کی چودہویں پشت سے ہوں۔"

"تمہارے جسم میں خون کی کمی ہے۔"

"خون! خون تو زندگی کی دلیل ہے۔"

"ہاں، میں ابھی زندگی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں ـــــ کون ہے اس کا ذمہ دار۔"

"یوسف کہاں یوسف ـــــ میری منگنی ہو چکی ہے۔

"منگنی سے اس خون کا کیا تعلق۔"

"خون کا خون سے ہی تو تعلق ہوا کرتا ہے۔"

غنودگی اب بھی طاری تھی اور اس غنودگی میں وہ معلوم نہیں کیا کیا بکے جا رہی تھی۔

"مزدوروں نے جھنڈے گاڑ دیئے"

"عورتوں نے احتجاجی نعرے بلند کئے۔"

"مردوں نے چٹانوں میں دراڑیں پیدا کر دیں"۔

"ڈاکٹروں نے انقلاب برپا کر دیا۔"

"یہ غلاظت ہے ـــــ پھینک دو اسے، جلا ڈالو اسے، زمین بوس کر دو اسے۔"

"پر اس معصوم کا کیا ہوگا؟ جو اس کے پیٹ میں کلبلا رہا ہے۔"

"معلوم نہیں، کس کا ہے، کون ہے اس کا ساجھے دار۔"

"کیا بغیر ساجھے کا یہ چولھا گرم نہیں ہوتا اور جب گرم ہونا فطری عمل ہے تو برف ہونا بھی عین فطرت ہے۔"

"پر برف، برف ہے گرم ہو کر برف ہونا گناہ ہے۔"

"گناہ ـــــ بدن کا یا روح کا۔"

"روح تو پاک ہے اس کی پاکیزگی پر کون حرف لگائے روح القدس کی پاکیزگی ہمیشہ بلند رہی ہے۔"

"مگر ـــــ!"

"یہ عفریت ہے۔"

"یہ پاپ ہے۔"

لوگ لعن وطعن بکنے لگے، اس کی نسبت غلاظت انڈیلنے لگے اور پھر ہجوم نے پتھر اٹھائے ـــــ اور دیکھتے دیکھتے پتھروں کا ڈھیر لگ گیا ـــــ شیشے ٹوٹے ـــــ کرچیں چبھیں۔ اور وہ درد سے کراہ اٹھی۔ ہجوم بڑھتا گیا ـــــ دائرے پھیلتے گئے اور اس دائرے کے محیط میں ـــــ مرکز پر کھڑے شخص سے جب اس کی آنکھیں ٹکرائیں تو وہ سہم کر رہ گئی ـــــ۔

ہجوم میں یوسف بھی شامل تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ـــــ۔

آنکھیں نم تھیں پر چہرے پر خوشی والم کے آثار نمایاں تھے ـــــ کہ وہ بیٹا جنی تھی ـــــ۔

●●

چیونٹی

"ارے کہاں مر گئی تصوّر کی بچی ـــــ ستیاناس کر دیا سارے دودھ کا۔"

جوں ہی دروازے پر پہنچا بیگم کی کرخت آواز نے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

"آخر ہوا کیا؟ جو تم آنگن میں ہی لاوے کی طرح پھوٹ رہی ہو۔" میں نے صدر دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا بتاؤں؟ اس تصور کی بچی نے ناک میں دم کر رکھا ہے دیکھنے کو تو اتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن عقل رتی بھر نہیں۔ کس چیز کو کہاں رکھنا ہے کچھ نہیں جانتی۔" بیگم نے شکایت کا ایک دفتر کھول کر رکھ دیا۔

"ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔" میں نے وضاحت طلب نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا۔

"دیکھئے نا ــــ آپ خالص دودھ کی چاہ میں نہار منہ گوالے کے گھر جاتے ہیں اور آپ کی لاڈلی ہے کہ دن دوپہر اسے برباد کر دیتی ہے۔"

"اب دیکھئے ـــــ، دیکھئے۔" دودھ کی ہانڈی میرے چہرے کے

قریب بڑھاتے ہوئے وہ جھنجھلائی "پوری ہانڈی چیونٹیوں سے بالکل اٹی پڑی ہے۔"

"ارے بھائی! ابھی بچی ہے، دھیرے دھیرے سب کچھ سیکھ جائے گی۔" میں نے بیگم کی خفگی کو رفع کرنے کی کوشش کی۔

"آپ اسے بچی کہتے ہیں۔ اس کے الھڑ پنے کی وجہ سے ہی اُن لوگوں نے رشتہ ٹال دیا۔" وہ گرم سیخ کی طرح سُرخ ہوئی جا رہی تھی اور میں برف کی طرح سرد پڑا جا رہا تھا۔ بیگم میری کیفیت کو شاید بھانپ گئی تھی اسلئے باورچی خانے میں جا دبکی اور میں سیدھا تصوّر کے کمرے میں چلا گیا۔

تصوّر اوندھے منہ پڑی سسکیاں بھر رہی تھی میری آہٹ پاتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ میں نے تسلی کے دو بول کہے، سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو وہ اور بلک بلک سی اٹھی۔ شاید وہ اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا، آنکھیں آبدیدہ تھیں اور اپنے آپ میں گم سم۔

تصوّر اپنی ماں کی تنبیہی گفتگو سے پریشان تھی۔ بالغ ذہن، سنجیدہ طبیعت، اپنی پسند چاہتی تھی ــــ دیدہ و دانستہ غلطی تو کرتی نہیں، لیکن کچی عمر، ناپختہ تجربوں کی بنا پر لاپرواہی کا گماں بھی گزرتا تو ماں برس پڑتی۔ جس سے اس کی سنجیدہ طبیعت کی انا کو ٹھیس پہنچتی اور وہ بلک اٹھتی۔

دیئے کی طرح ہمیشہ روشن رہنے والی اور دوسروں کو منوّر رکھنے والی بیگم، آج بہت اداس لگ رہی تھی۔ ویسے اداسی تو اس صدی کا مقدر ہے لیکن تھرکنا، چہکنا اور مست الست رہنا ہی تو زندگی کی علامت ہے ــــ لیکن اب بیگم نیم گفتگو سے کام لے رہی تھی ــــ بہت کم باتیں، اشاروں سے زیادہ کام لے رہی تھی۔

دودھ میز پہ ہے ــــ ماچس تکیہ کے نیچے ــــ ٹارچ بازو میں ــــ، میں دودھ پی کر جب بستر پر گیا، بیگم سو چکی تھی۔ بستر پر مجھے تنہا پا کر مصائب و آلام نے گھیر لیا ــــــ۔

جوان بیٹی، وہ بھی سوشیل، پڑھی لکھی، باشعور اور ذہین ـــــ

آج یاس و امید کے درمیان جھول رہی تھی۔ جب سے اس نے کالج چھوڑا تھا بالکل بجھی بجھی سی رہتی۔ کسی سے ملنا جلنا نہ کہیں آنا جانا۔ اپنی سہیلیوں سے بھی منہ پھلائے، خود کو ایک خط میں سمیٹے ہوئے ـــــ وہ خط جس کی لمبائی تو ناپی جا سکتی ہے لیکن موٹائی اور چوڑائی کا اندازہ ممکن نہیں۔ ایسا لگتا کہ جیسے اندر ہی اندر کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔ جس کی میٹھی تپش کو محسوس تو میں بھی کر رہا تھا لیکن بیان کرنے کی قوت نہیں پا رہا تھا۔

وہ لوگ بھی تو نہایت کم ظرف نکلے۔

دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے نباہ کی صورت نکال لینے میں کیا برائی تھی۔ لیکن وہ لوگ سودے بازی پر اتر آئے۔ ویسے میں اپنی اوقات اور استطاعت سے بڑھ کر دینے کو تیار تھا لیکن نقد کی صورت میں کچھ دینے کا قائل نہیں تھا ـــــ یہ تو خرید و فروخت کی بات ہوئی ـــــ میں نے صاف انکار کر دیا۔

میں بستر پر کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ کسی لمحہ چین نہیں پا رہا تھا ـــــ ایسا لگتا تھا جیسے سارے جسم میں کوئی مخفی سی چیز سرسرا رہی ہو۔ دائیں، بائیں ـــــ جس کروٹ بھی ہوتا سرسراہٹ اپنی جگہ قائم رہتی۔ میری کروٹ پر کروٹ سے بیگم جاگ اٹھی۔

"کیا ہوا؟"

"معلوم نہیں! کونسی چیز ہے جو سرسرا رہی ہے ایسا لگتا ہے کہ بستر پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔"

"آج ہی تو چادر بدلی ہے، پھر یہ سرسراہٹ کیسی؟"

"لیکن سرسراہٹ تو ہے۔"

"تصور تو روزانہ فنائل سے دھوتی، پوچھتی رہتی ہے۔ جنگلہ، کواڑ، پلنگ ـــــ وہ تو آپ سے زیادہ نفاست پسند ہے۔

اور پھر وہ سو گئی ــــــ۔

لیکن میری نیند اُچٹ گئی تھی۔ میری بے تابی اتنی بڑھی کہ اٹھ کر اپنے حصّے کے بستر کو الٹ پلٹ دیا۔

تکیہ بدلا،

پہلو بدلے ــــــ

لیکن نیند روٹھی ہی رہی۔

دیوار گھڑی کے میوزیکل آلارم پر میں چونک پڑا ــــــ صبح کے چار بج گئے تھے۔ رات بے چینی میں ہی کٹ گئی تھی جیسے نرم و گداز بستر کانٹوں کا بستر بن گیا ہو۔ جسم میں چیونٹیوں کی خاردار ٹانگیں چبھتی رہیں اور میں تڑپ تڑپ کر پہلو بدلتا رہا۔ کسی پہلو آرام نہ آیا تو اٹھ کر صوفے پر خود کو پھینک دیا۔ صوفے کی گداز بانہوں میں بھی چند ثانیے کے بعد وہی بے چینی نے آگھیرا۔ شاید میرے جسم کے میٹھے ذائقے کو چیونٹیوں نے یہاں بھی محسوس کر لیا تھا اور پھر چند لمحوں کے بعد ہی پورے جسم میں ایک تناؤ کے ساتھ وہی سرسراہٹ ــــــ سر سے پاؤں تک رینگتے ہوئے بن ہڈی کے یہ کیڑے میرے جسم کو جیسے اندر ہی اندر چاٹ رہے تھے اوپر، اوپر کچھ نہ تھا لیکن اندر ہی اندر کسک اور سرسراہٹ کو محسوس کر رہا تھا۔

صبح دفتر میں ساتھیوں سے جب اس کا ذکر کیا تو مشورے کی ایک طویل فہرست سامنے آگئی۔

"اچھے طبیب کو دکھاؤ۔"

"نہیں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

"بہتر ہوتا کسی مولوی سے گنڈہ لے لیتے، ہوا کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔"

"باسی منہ آئینہ دیکھ لینے سے بھی ایسا ہوتا ہے، بہتر ہو گا سات دن لگاتار مرغی کے انڈے کی زردی کا لیپ پورے جسم میں لگاؤ۔"

میں پریشان تھا کہ کس پر عمل کروں اور کس پر نہیں ــــــ پھر سوچا،

چلو اپنے یار ڈاکٹر فیروز سے مشورہ کرلوں۔ دفتر سے چھٹی لیکر سیدھا اسکے کلینک پہنچا۔

"کیا ہوا یار؟" اس نے میرے اداس چہرے کو پڑھتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں، ساری رات سو نہیں سکا۔"

"کیوں؟ کیا بھابھی پریشان کرتی رہی!"

"مذاق چھوڑو ــــ میں ساری رات پریشان رہا۔ پورے جسم میں عجیب سی سرسراہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ کسی کل چین نہیں پاتا ــــ دفتر میں بھی سارا وقت پریشان اور بے چین رہا۔"

"صرف سرسراہٹ ہی ہے نا ــــ الرجی ہے ــــ ایول (Avil) لے لو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔" نہایت لاپرواہی سے فیروز نے کہا۔

میں اس کے یہاں سے مفت کا ایول لیکر چلا آیا ــــ ایول جیب میں ہی پڑا رہا ــــ اور میں باہر ــــ بے چین، پریشان اور قابلِ رحم بنا پھرتا رہا۔

گھر پہنچا تو بیگم نے نیم گرم پانی غسل کیلئے تیار کر دیا اور پھر ڈیٹول سے غسل کی تاکید کر کے باورچی خانے میں میرے لئے چائے تیار کرنے چلی گئی۔

غسل کے بعد حسب عادت صوفے میں دھنسا، میں چائے کی چسکی لے رہا تھا لیکن کمبخت چائے بھی ذہن کو فرحت نہ بخش سکی بلکہ ذہن مزید بوجھل ہو گیا۔ سر بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا رگیں بھی تن سی گئیں تھیں۔ جسم کے تمام اعضاء میں تناؤ سا ہونے لگا تھا۔ تب ہی میں نے اپنے جسم میں پھر اس سرسراہٹ کو محسوس کیا۔ سارے جسم پر بے شمار چیونٹیوں کے رینگنے کا احساس جاگ اٹھا۔ ایک ادنیٰ سے کیڑے نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اپنے اوپر نمرودی عذاب محسوس کرنے لگا تھا۔ نمرود کا خیال آتے ہی میرا سر خدا کی عظمت کے آگے جھک گیا۔

تو ہی ساری دنیا کا مالک ہے،

محافظ ہے،

دیدہ و نادانستہ، تمام گناہوں سے تو ہی واقف ہے،

بخشش کرنے والا بھی تو ہی،

پرستش کے لائق بھی تو ہی،

خطاؤں کو درگذر کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

—— اور پھر گھنٹوں خدا کی بارگاہ میں خود کو پیش کر کے گڑگڑاتا رہا۔ بخششیں مانگتا رہا —— رنج والم سے نجات چاہتا رہا۔

جیب میں ایول پڑا ہوا تھا —— اور سامنے ڈاکٹر فیروز، لاپرواہی کے رنگین کاغذ میں لپیٹے انسیت کا نسخہ لئے مجھے گھورے جارہا تھا۔

بیگم میرے لئے دودھ گرم کر رہی تھی شاید اسی لئے باورچی خانے سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھی کہ کہیں اُبال کھا کر دودھ فرش پر نہ بہہ جائے۔ اسے چولھے پر ابلتے دودھ اور میز پر بکھری کتابیں کبھی پسند نہیں آئیں۔ ہمیشہ اپنی زلفوں کی طرح سبھوں کو سمیٹ کر رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن جس کا بکھرنا مقدر ہوتا ہے اسے سات خانوں میں بھی چھپا کر رکھا جائے تب بھی وہ تنکے تنکے بکھر کر ہی رہتا ہے —— آسمان کا لکھا فرش پر پتھر کی لکیر بن کر رہ جاتا ہے۔

چیونٹیوں کا رینگنا، جسم پر بدستور قائم تھا ویسے اسکی سرسراہٹ لمحے دو لمحے چپکی سادھ لیتی لیکن پھر تھوڑے وقفے کے بعد وہی سرسراہٹ اور چیونٹیوں کا رینگنا —— اس وقت میری بے چینی، زندگی کے سیاہ کینوس پر پھیل کر رہ جاتی اور میں اپنی بے بسی پر تلملا اٹھتا ——

کمبخت کیڑے نے سارے جسم کو جگہ جگہ سے سجا کر رکھ دیا تھا ——

ٹھیک اسی لمحے بیگم کی چیخ ابھری —— میں سمجھا شاید دودھ اُبال کھا کر فرش پر اُمنڈ آیا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بیگم کی چیخ نے دماغ ماؤف کر دیا —— میں اس کی اور لپکا۔

بیگم تصوّر سے لپٹی زار و قطار رو رہی تھی۔ تصوّر نے زہر کی پوری شیشی حلق میں انڈیل لی تھی۔ جسم سیاہ پڑ گیا تھا، چہرہ نیلا ہو گیا تھا ——

لب خشک تھے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی۔

جوان بیٹی کے مردہ جسم کو دیکھ کر، میرے اندر کپکپی سی طاری ہو گئی ـــــ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جسم برف کی طرح سرد پڑنے لگا ـــــ اور کب میں فرش پر لڑھک گیا، مجھے خود پتہ نہیں چل سکا۔

آنکھیں کھلیں تو لوگوں کا ہجوم تھا ـــــ اپنے پرائے، عزیز واقارب، دوست واحباب، پاس پڑوس اور دور دراز کے لوگوں کے درمیان میں گھرا تھا، سارے کپڑے گیلے تھے اور جیب میں پڑا ایپل بھی برباد ہو چکا تھا۔ مجھے ہوش میں لانے کے لئے شاید مجھ پر گھڑوں پانی انڈیلا گیا تھا ـــــ سردی کا احساس ہوا تو کپکپی سی آ گئی اور پھر میں نے خود کو ایک گٹھری کی طرح سمیٹ لیا ـــــ اس سے بڑی قوت ملی، اور خود کو میں نے بڑا پرسکون سا محسوس کیا کہ شاید اب چیونٹیوں کا رینگنا اور اس کی سرسراہٹ جیب میں بھیگے ہوئے ایپل میں سمٹ آئے تھے۔

●●

خوشبو

خوشبو چاہے گاؤں کی سوندھی مٹی کی ہو یا جوان جسم کی، اگر چاہت کے روحانی جذبوں سے مملو ہو تو سارے جسم کو معطر کئے بغیر نہیں رہ سکتی، اور وہ تو سر تا پا خوشبو ہی خوشبو تھی، حسن، خیر اور سادگی کی نمائندہ، زندگی آمیز رویوں کی عکس نما ـــــ ہر زاویے سے کسی کسائی، پُرنور چہرہ ـــــ ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے نہایت سنجیدگی سے سنوارا اور تراشا ہو۔ جہاں سے گزرتی اپنے ہنستے ہوئے چہرے اور دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے وجود کی مہک بھی بکھیرتی جاتی۔

لیکن آج خوشبو پر ہی خوشبو انڈیلی جا رہی تھی ـــــ کافور کی بو، عطر کی مہک، کیوڑے کی خوشبو، ـــــ گویا ہر سو خوشبو ہی خوشبو۔

بیر کے پتے کے جوش دیئے ہوئے گرم پانی سے جب اس کے اکڑے ہوئے جسم کو دھویا گیا تو اس کا بدن چاندی کی طرح دمک اٹھا تھا، عطرپاشی سے تو وہ اور بھی مہک مہک اٹھی تھی تب ہی شاید خوشبو کو منوں مٹی کے نیچے اُتار دیا گیا۔

لیکن خوشبو چاہے مشک کی ہو یا عشق کی، مقسوم میں بند نہیں

رکھی جا سکتی۔ اس کا مقدر ہے پھیلنا ــــ اور وہ تو میرے تن کی اپنی خوشبو تھی۔
منوں مٹی کے نیچے دب کر بھی اپنی قربت کا احساس دلا رہی تھی۔

خوشبو کی وہ پاگل کر دینے والی مہک آج بھی میری سانسوں میں پیوست تھی اس کی آواز کی مدھر کھنک، مجھے آج بھی اپنے در و دیوار سے صاف سنائی دیتی جیسے دیواریں بولتی ہوں۔

"ماسٹر جی!" اجنبی آواز سے چونک پڑا۔

وہ دروازے کو پوری طرح کھول کر ایک کنارے سمٹتی ہوئی بولی۔

"عصمت اور نیلو تو کہیں باہر گئی ہیں، ویسے آپ تشریف رکھئے۔"

"جی بہت بہتر" بمشکل تمام میری زبان سے یہ بات نکل پائی ورنہ میری آنکھیں تو حیران تھیں کہ شیشے سے تراشی ہوئی دیوی کے لب ہل رہے تھے۔ تب ہی وہ میرے تیر نیم کش سے گھبرا کر کچھ اور سمٹ سی گئی۔ اس وقت وہ بالکل حیا کی دیوی لگ رہی تھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"آپ کون ہیں؟، اس سے قبل یہاں کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔"

"دیکھتے بھی کیسے، میں یہاں تھوڑی ہی رہتی ہوں۔ یہ تو میری خالہ امی کا گھر ہے۔" وہ ایک سانس میں بول گئی اور میں اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہ گیا۔

دوسرے دن جب میں ٹیوشن دینے گیا تو دونوں بچیوں کے ساتھ وہ بھی آ بیٹھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام خوشبو ہے اور امسال بی اے فائنل کا امتحان دے چکی ہے۔

میں نے بھی اپنی ہلکی پھلکی شناخت کراتے ہوئے کہا ــــ

"ایم اے کرنے کے بعد ایک غیر سرکاری کالج میں لکچرار ہوں، غربت کی ہانڈی میں پکا ہوا ادھ کچا انسان سمجھئے۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ــــ پکے اور ادھ کچے کی پہچان تو خود طی

انگلیوں پر چھوڑ دیجیے۔"

"مخروطی انگلیوں کی قربت کا احساس تو آدم کی اولاد کو بڑا تلخ ہوا ہے

میں نے جواباً جملہ داغ دیا۔

"انسیت کی دبیز چادر پہلے تان تو لیجئے ـــــ تلخی خیبر نیت میں بدل

جائے گی۔" اس نے اپنا آدھا چہرہ اوڑھنی سے چھپاتے ہوئے کہا۔

میں لاجواب ہو کر کچھ کھو سا گیا تو اس نے پھر ضرب لگائی۔

"کیا سوچنے لگے؟"

"آپ کے سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔" میں نے چونک کر کہا۔

"مل گیا؟"

"نہیں پھسل گیا۔"

"مردوں کی گرفت ہمیشہ کمزور رہی ہے۔"

"نہیں ـــــ کمزور نہیں ـــــ ڈھیلی رہی ہے۔"

تب ہی شیشۂ دل پر غزل کی شبیہہ ابھری۔

تیکھے خدوخال کی معصوم اور نرم دکھنے والی غزل میں بلا کی نمکینیت تھی

جیسے تیلگو یا مدراس کی سوداسکریں کی کوئی نوخیز کلی ہو۔ ہم دونوں قریب قریب ایک

ہی عمر کے تھے ـــــ مدرسے کے زینے سے لیکر اسکول کی دہلیز تک ساتھ ساتھ چلنے

والی غزل نے کب اور کس لمحے ہمسفر بننے کا خواب بن لیا یہ کہنا مشکل تھا پر ایکدن

وہ بے دھڑک پوچھ ہی بیٹھی ـــــ

"مجھے اپنا ہمسفر بنانا پسند کریں گے؟

"ظاہر ہے، ابتک ہمسفر ہی تو رہے ہیں۔" میں نے گول مٹول جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے، زندگی کے نشیب و فراز میں میرا ساتھ نباہ پائیں گے۔"

اس نے وضاحت چاہی۔

"نباہ کی صورت تو چاہت میں ہوتی ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"مطلب یہ کہ، چاہ اور چاہت کے بغیر نباہ کی کوئی دوسری صورت نہیں ـــــ لیکن بعض لوگ تو بغیر چاہت کے نباہ کی ڈمر میں بندھے رہتے ہیں۔" اس نے کہا۔

اور پھر اس کی چاہت بڑھتی گئی اور میں بھی اس کی طرف کھنچتا چلا گیا ـــــ غزل، مولوی خدا بخش کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ماں اس کی پیدائش کے کچھ ہی دن بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ مولوی خدا بخش نے اپنی بے پناہ محبت سے غزل کو اپنے ہاتھوں سنوارا تھا۔ مولوی صاحب بچوں کو دینی درس دیتے، محبت و اخوت کی تبلیغ کرتے۔ میں نے بھی درس قرآن پاک انھیں کے ہاتھوں لیا تھا ـــــ مجھے ان سے بے پناہ عقیدت تھی اور وہ بھی بے انتہا مجھ سے محبت رکھتے تھے اور شاید اسی کسی لمحے غزل سے متعارف ہونے کا موقع ملا تھا۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور جب سنِ شعور کی بو فضا میں پھیلی تو میں غزل کی شگفتگی کو اپنی مٹھیوں میں بھینچنے کے لئے بے چین ہو اٹھا۔ مولوی خدا بخش نے شروع میں تو عمر کے فاصلے کی باڑھ کھینچ دی ـــــ لیکن دینی و علمی لیاقت کو جوازِ حالات بنا کر اپنے ارادوں میں محصور ہو گئے۔

اس طرح غزل میرے نکاح میں آگئی ـــــ۔

نکاح کے بعد عورتوں کی جھرمٹ میں گھرا، میں تن تنہا سبھوں کو تشفی بخش جواب دے رہا تھا کہ کسی نے آئینہ بڑھاتے ہوئے پوچھا ـــــ۔

"آئینہ میں دیکھ کر بولئے جناب ـــــ آسمان کا چاند خوبصورت ہے یا آئینہ کا۔"

اس وقت آئینہ کی سطح پر ابھری ہوئی صورت سے میں بہت خوش ہوا تھا ایسا لگا کہ جیسے چاند زمین پر روشن ہو گیا ہو۔

لیکن آج شیشۂ دل پر ابھری شبیہہ سے میں گھبرا گیا۔ اور گھبرا کر میں نے ایک بھاری پتھر دے مارا۔ شیشہ چور چور تھا یا غزل چور چور تھی، میں

نہیں کہہ سکتا ـــــ پر میں اپنے مضبوط ارادوں کی آہنی قوت کے ساتھ خوشبو کی طرف بڑھتا چلا گیا اور وہ بھی کچھ پس و پیش کے بعد سمٹتی سمٹاتی میری باہوں میں جھول سی گئی

"زندگی کا معیار کیا ہے؟"

"دو وقت کی روٹی۔"

"نہیں شوخ بدن۔"

"بیمار ذہن کے لئے شوخ بدن کیا!"

"ذہن کی تازگی بھی تو بدن کی شوخی میں پنہاں ہے۔"

تو وہ کچھ اور سمٹ آئی ـــــ اس وقت اس کے کنوارے جسم کی میٹھی خوشبو کتنی بھلی لگ رہی تھی۔ بھینی بھینی خوشبو سے میں بے حال ہوا جا رہا تھا۔

اچانک گھڑیال میں بارہ کا گھنٹہ بج اٹھا ـــ اور میں گھونگھے کی طرح خود میں سمٹ کر اپنے وجود کو ٹٹولنے لگا۔ ...... اپنی پہچان اپنی شناخت ڈھونڈنے لگا ـــ۔

تبھی شاید خوشبو کے چہرے پر ایک نیا چہرہ اُگ آیا ـــــ

اپنی شناخت،

اپنی پہچان لئے ـــــ۔

میں خوش تھا کہ خوشبو نے میری زندگی کو معطر کر دیا ـــــ۔

غزل کی طویل نامراد ہمسفری نے جہاں میرے دل پر زخم لگائے تھے، خوشبو نے وہاں اپنے جذبات و احساسات سے مملو چاہت کے نقوش ثبت کر دیئے تھے۔

میں سمجھا، چلو غزل کو بھی اپنی شناخت مل گئی۔

لیکن غزل کو ادھار کی موسیقیت پسند نہ آئی اس نے بڑھ کر خوشبو کے منہ پر تھوک دیا ـــــ۔

تب سیندور کی سرخی میں گوندھی ہوئی غزل کے سامنے، خوشبو کو اپنے کنوارے جسم کی چمک ماند نظر آنے لگی۔

پھر بھی خوشبو خوش تھی کہ اس کا تو مقدر ہی ہے بلاامتیاز سبھوں تک اپنی مہک یکساں پہنچانا ــــ فریب وایثار کے درمیان وہ کبھی نہیں جھولی۔

لیکن آج غزل کے تنقیدی شعور پر خوشبو تلملا اٹھی، جھنجھلا اٹھی اور پھر اس نے اپنا گلا خود گھونٹ لیا ــــ۔

اور شاید۔یہی وجہ تھی کہ آج خوشبو کو خوشبو میں بسایا جا رہا تھا، ــــ خوشبو پر ہی خوشبو انڈیلی جا رہی تھی۔

کافور کی بو، عطر کی مہک، کیوڑے کی خوشبو، گویا ہر سو خوشبو ہی خوشبو۔۔۔

●●

رسائی

"اللہ اکبر ـــــ"

اور پھر میں نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ لئے چاروں طرف خاموشی چھا گئی اس خاموشی کو چیرتی ہوئی پیر و مرشد کی بلند اور پر وقار آواز فضا میں گونجی ـــــ اور پھر حاضرین پر سکتہ سا چھا گیا سبھوں کی آنکھیں نم تھیں اور لب خاموش تھے لیکن ان میں سے بعض پیر و مرشد کی بازگشت کو زیر لب دہرا رہے تھے اور بعض آنکھیں نم اور لب پر خاموشی طاری کئے، دھڑ سے آزاد اپنا من لئے دفتروں، کالجوں، کارخانوں، شاہراہوں اور تفریح گاہوں میں بھٹک رہے تھے۔

میں نے اپنی آنکھیں پاؤں کے انگوٹھے پر مرکوز کر لیں۔ موٹے اور بھدے سے انگوٹھے پر، کراہیت سی ہونے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے قد کا جائزہ لیا تو قدرے خوشی ہوئی کہ میں دراز قد دِکھ رہا تھا۔ چند ثانیہ کیلئے خوشی تو ہوئی لیکن دفتر کا خیال آتے ہی میرا چہرہ لٹک گیا اور میں خود میں سمٹ آیا کہ دفتر میں اب بھی میرے کوتاہ قد ہونے کا سرٹیفیکٹ محفوظ تھا۔

دفتر کا خیال آتے ہی اس قلم کی گمشدگی کا احساس بھی جاگ اٹھا۔

قلم، جو پڑھے لکھوں کی شمشیر ہوا کرتا ہے اور اس قلم سے تو میری انسیت کچھ زیادہ ہی تھی کہ وہ قلم دفتر کی پیچیدگیوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ وہ تو دفتر کی گتھیوں کو اپنی نوک پر سجائے رکھتا تھا۔ میری ذرا سی جنبش سے بوتل کے جن کی طرح پلک جھپکتے اچھے برے نتائج کو فائلوں میں سمیٹ لیتا تھا۔ ٹھیکیداروں کی زبان تو وہ قلم خوب خوب سمجھتا تھا۔ کس کو ٹنڈر دینا ہے کس کا رد کرنا ہے۔ اخراجات کے تخمینہ پر تو اس کی گرفت بہت مضبوط تھی اور سب سے بڑی خوبی تو رخسار کی وابستگی تھی۔ قلم جیب میں ہوتا تو ایسا گماں گزرتا کہ رخسار رگِ جاں سے قریب ہے۔ شاید کبھی یہ رخسار کی مخروطی انگلیوں میں کھیلا ہو اور اس کے سرخی مائل ہونٹوں میں دبا بھی ہو۔ یہ سوچ سوچ کر میرے تن بدن میں گدگدی سی ہونے لگتی۔

رخسار میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی، وہ اپنا فاضل وقت میرے ساتھ ہی گزارتی۔ معلوم نہیں وہ مجھ میں کیوں اتنی دلچسپی لیتی۔ میری ہمیشہ دلجوئی کرتی اور میری ہمت بندھاتی ــــــ اسی طرح وہ میرے حوصلے کی پوٹلی کو ہمیشہ گرم رکھتی اور اکثر کہتی

"حوصلے کی پوٹلی گرم ہو تو وقت کی روٹی پوری طرح سینکی جا سکتی ہے ورنہ سرد حوصلے کا ایک نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا۔"

وہ میری کمزوری سے اچھی طرح واقف تھی شاید اسی لئے مجھے کبھی کمزور پڑنے نہیں دیتی بلکہ ہمیشہ بلند سے بلند مینار کی جانب کھینچتی۔ زندگی اور زندہ دلی کا درس دیتی۔

رخسار ایک بڑے گھر کی اکلوتی لڑکی تھی، بڑے لاڈو پیار میں پلی تھی۔ شاید اسی لئے اپنی چھوٹی سی چھوٹی ضرورتوں کے لئے بھی سینکڑوں روپے پھونک ڈالتی کالج کی فیس اور اس کے ذاتی اخراجات کیلئے بینک اکاؤنٹ میں ہزاروں روپے ہر وقت موجود ہوتے جس سے وہ نہ صرف اپنی ضرورتیں پوری کرتی بلکہ میری ضرورتوں پر بھی گہری نظر رکھتی۔

میں رخسار کی انہیں عنایتوں کا اسیر تھا اور پھر رفتہ رفتہ میں اس کے احسانوں تلے دبتا چلا گیا کہ میں بڑا بے بس اور نہایت مجبور تھا۔

پاپا بستر پر پڑے اپنے آخری ایام گزار رہے تھے ممّی کی خواہش تھی کہ بیٹا کسی طرح گر۔یجویٹ ہو جائے کہ ان کے میکے میں سرسوتی ہی کی قدر تھی وہ چاہتی تھی کہ اسکا بیٹا اپنے ننھیال کا پرتو بن جائے کہ پاپا کے پرکھوں نے تو سرسوتی کو معاشی ضرورتوں کے میلے چیتھڑے میں لپیٹ کر منوں مٹی نیچے دفن کر دیا تھا۔

اسی لئے پاپا میٹرک بھی پاس نہ کر پائے تھے کہ کوئلے کی کانوں میں اتر آئے۔ جہاں دو وقت کی روٹی کے عوض کئی گرام خون چوس لیا جاتا — اور پھر ابدی نیند سونا اس کا مقدر بن جاتا۔ ممّی اس خوف سے ہی کانپ سی اٹھتی۔

شاید اسی لئے اس نے ایک آہنی عزم کیا تھا مجھے کالج کی دہلیز تک لا چھوڑا تھا تا کہ کالج کی ڈگری کے بعد کسی دفتر کے لائق ہو جاؤں، اور کہیں ملازمت مل جائے۔ اس کے لئے ممّی کافی محنت کرتی۔ دن رات دوسروں کے کپڑے سیتی۔ اڑوس پڑوس کے گھروں میں مزدوری کرتی تب جا کے کہیں ماہ ڈیڑھ ماہ میں، اپنا آدھا پیٹ کاٹ کر میرے لئے کچھ روپے بھیج پاتی جو میری ضرورتوں کا نصف بھی نہ ہوتا — وہ تو رخسار تھی جو میری ضرورتوں کا منہ کھلتے دیکھ کر ہی اپنی چاہت کی بوچھار کر دیتی۔

کبھی کبھی تو میں اپنے آپ میں بجھ سا جاتا پر اس وقت ماں کی منوّر صورت سے روشنی پھوٹتی نظر آتی — تب میں رخسار کی انسیت میں لپٹی فراخدلی پر ریجھ سا جاتا — کبھی سنکوچ کرتا بھی تو وہ بڑی دانشمندی سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی اور پھر میں بھی راضی بہ رضا اس کے ہمراہ ہو لیتا — وہ اکثر کہتی —

"تمہاری کامیابی میں ہی میری کامیابی ہے۔"

"اگر میں کامیاب نہ ہوا تو ...."

"یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں؟"

"اسلئے، کہ تم میں وقت اور حالات سے لڑنے کی قوت ہے اور منزل اُسے ہی ملتی ہے جو وقت اور حالات کو اپنی مٹھی میں کر لیتا ہے اور یہ حالات سے جنگ کے بغیر ممکن نہیں۔"

"تو گویا میں جنگجو ہوں؟"

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ـــــ بلکہ میں تمہارے اندر صبر و استقلال کی اُس حدت کو محسوس کر رہی ہوں جو وقت اور حالات کے وزنی پتھر کو بھی پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔"

"ہمت افزائی کا شکریہ۔!"

اس طرح رخسار کی انسیت اور بے لوث چاہت نے مجھے زیور تعلیم سے آراستہ کر دیا۔

پھر ایک دن جب جدائی کا وقت آیا اور کالج کا الوداعی پروگرام چل رہا تھا۔ میں اپنے روم میں سمٹا سمٹایا تنہا بیٹھا مستقبل کے خواب بُن رہا تھا کہ رخسار مجھے تلاش کرتی ہوئی اِدھر آدھمکی۔

"کیوں، تنہا خواب بن رہے ہیں ـــــ مجھے بھی شریک کر لیجئے۔"

"خوشیاں بانٹی جاتی ہیں، اداسیاں نہیں۔"

"کہا جاتا ہے کہ غم بانٹنے سے اداسی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔"

"لیکن اداسی جس کا مقدر بن گئی ہو۔"

"اسے احتجاج کرنا چاہئے کہ اداسی اور غم کو چھپائے رکھنے سے تو وہ سوکھ کر کانٹا بن کر رہ جائے گا۔"

"احتجاج! نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔"

"آواز میں اگر چاہت ہو تو پہاڑوں میں بھی شگاف پیدا کر دیتی ہے۔"

"لیکن یہاں تو چاہت دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر مفلوج ہو گئی ہے۔"

تب میں نے رخسار کے گرم گرم ہاتھوں کے لمس کو محسوس کیا جو شاید میرے کاندھے پر دھیرے دھیرے اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے

کہا....... "آپ جیسا انسان تو پتھریلی راہوں میں بھی ننگے پاؤں دوڑ سکتا ہے آپ خود کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہیں۔"

"آپ کا سوئے ظن ہے ــــ میں مفلوج انسان، چلنا تو درکنار، اپنی لنگڑی زندگی کو منزل کی اور دو قدم گھسیٹ بھی پاؤں گا کہ نہیں۔"

"حوصلے جواں ہوں تو منزل خود سمٹ آتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ جوان ہیں۔ حوصلے بھی جواں رکھئے۔"

"ایسی جوانی پر تف! آپ نہیں ہوتیں تو میں کیا ہوتا۔؟ .... احسانوں کے بوجھ میں دبے ہوئے ایک مجروح انسان کو جوانی کی پُر کیف فضا کی نوید سنا رہی ہیں۔"

"حضور! میرا بوجھ میرے ہی کاندھے پر رہنے دیجئے کہ میں آپ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی ــــ! اب رہی میری انسیت اور چاہت، تو اسے ہمدردی اور احسانوں کے باٹوں سے نہ تولیئے۔"

"رخسار ــــ میرا مطلب یہ نہ تھا"

"میں سمجھ رہی ہوں ــــ لیکن آپ خواہ مخواہ غیر ضروری باتیں سوچ سوچ کر دبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ میں اگر آپ کے کام آسکی تو میرے لئے یہ باعثِ مسرت ہے للّٰہ میری خوشی کو تو نہ چھینئے۔"

"لیکن ایک انجانے خوف سے میرا سر بیٹھا جا رہا ہے۔"

"لائیے! آپ کا سر دبا دوں۔"

"کاش میری گردن دبا سکتیں" میں نے دل ہی دل میں کہا اور میرے ہاتھ سر کے بالوں میں الجھ گئے۔

"کیا ہوا؟" کہتی ہوئی رخسار اپنے نرم نرم ہاتھوں میں میری کھردری اور سپاٹ ہتھیلی کو لیکر اسکی مٹتی ہوئی ریکھاؤں کو پڑھنے لگی یا پھر شاید ان دیکھاؤں میں وہ اپنا مقام ڈھونڈنے لگی ــــ اچانک گھبرا کر اٹھی اور پرس سے اپنا ایک قیمتی قلم نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی ــــ "لیجئے ــــ جب کبھی غم کے

بوجھ یا خوف سے آپکا سر پھٹنے لگے تو اس قلم سے چند سطریں لکھ کر، مجھے بھی شریکِ غم کر لیا کیجئے گا ــــ اس قلم کی پشت پر ربراسٹامپ ہے جس پر میرا پورا پتہ درج ہے۔"

"اتنا قیمتی تحفہ۔"

"آپ سے تو زیادہ قیمتی نہیں ــــ ویسے اس قلم سے آپ کو میری یاد آتی رہے گی۔"

اور پھر وہ دور میری گرفت سے بہت دور چلی گئی ــــ وہ بمبئی کی رہنے والی تھی۔ کسی سائیکل فیکٹری کے مالک کی بیٹی تھی۔ فیکٹری کے علاوہ اس کے پاپا کے اور بھی کئی طرح کے کاروبار تھے۔ جن کا ذکر وہ اکثر کیا کرتی تھی۔ رخسار کے ایک ماموں جدّہ میں تھے جن کے بارے میں وہ کہا کرتی کہ ان کے بڑے ٹھاٹ باٹ ہیں ان کا بڑا لڑکا عدنان اس سے تین چار سال بڑا ہے مدرسے کی تعلیم دونوں نے ایک ساتھ ہی بمبئی میں لی تھی لیکن اب وہ بھی ماموں کے ساتھ جدہ میں ان کا کاروبار سنبھالتا تھا۔

رخسار کے ماموں جسے وہ جدّی ماموں کہتی تھی اس کو ہر سال کوئی نہ کوئی قیمتی تحفے ضرور بھیجتے اور یہ قلم تو اس کے جدّی ماموں کے اس فرزند کا تحفہ تھا جو کبھی ابتدائی تعلیم میں اس کے بہت قریب رہا تھا۔

اس دن کالج سے جاتے جاتے رخسار وہ قلم مجھے عنایت کر گئی جس کی نوک سے میں اپنے بکھری زندگی کو سمیٹنے لگا اور جب بھی فرصت ملتی میں اسے اپنی بکھری سمٹی زندگی کی پُرپیچ حقیقتوں سے آگاہ کرتا رہتا۔ شروع شروع میں تو رخسار میرے خطوں کے جواب پابندی سے دیا کرتی تھی لیکن اِدھر تقریباً ایک سال سے بالکل خاموش تھی ــــ نہ روٹھنے کی وجہہ لکھتی نہ منے کی صورت ہی بتاتی ــــ۔

اور پھر میں بھی مجبوراً خاموش ہو گیا کہ اب وہ قلم ہی کہاں جو میری روح کو تڑپا دے ــــ قلم کیا گم ہوا، وہ مجھ سے دور ہو گئی اس کی انسیت اور چاہت پر جیسے گرد جم گئی ہو۔ وہ اب ذہن کے دریچے میں بھی دھندلی سی ہی ابھرتی

ایک دن جدّہ سے رخسار کا خط آیا۔ ـــــ لکھا تھا۔

"میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کل تک جب بمبئی میں تھی یا پانے کبھی آپ کے خط کا بُرا نہ مانا ـــــ لیکن یہاں! ـــــ وہ اچھا نہیں سمجھتے ـــــ آپ کے کالیج کا آئیڈنٹیٹی کارڈ بھجوا رہی ہوں جو کبھی شاید میرے پاس رہ گیا تھا اور جسے میں اب لوٹانے پر مجبور ہوں کہ مجبوری شاید عورت کا دوسرا نام ہے۔

اُمید ہے اپنی سانسوں کی آخری گھڑی تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے ـــــ لیکن یہ شاید آپ کے لئے ممکن نہیں ـــــ۔

کالج کی ساتھی ـــــ رخسار"

"السّلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ!"

پیر و مرشد نے سلام پھیرا تو میں نے بھی سلام پھیر دیا تب سلام پھیرتے وقت مجھے ہوش آیا ـــــ کم بخت یہ قلم کہاں سے آن ٹپکا اور یہ رخسار کدھر سے آنکلی۔

توبہ، توبہ ـــــ

توبہ اس قلم پر بھی نہیں، توبہ اس رخسار پر بھی نہیں ـــــ تو پھر...

ارکان تو پورے ہو ہی چکے تھے لیکن آسمان تک میرے سجدوں کی رسائی شاید رخسار کی طرح ادھوری ہی رہ جائے۔ ●●

"قبر سے چمٹے رہنے سے کیا فائدہ! مرنے والے واپس تو نہیں آتے۔"

"خبردار! جو پھر ایسی باتیں زبان پر لائے۔"

"آج جو تم ڈاکٹر کہلا رہے ہو، وہ انھیں کی نوازشوں کا نتیجہ ہے۔ اور تمہارا بچہ جو کانوینٹ میں پڑھ رہا ہے وہ بھی انھیں کی عنایت ہے۔"

"لیکن ممی ـــــ دنیا والے ان کی نسبت سے آپ کو بدنام کریں، یہ مجھے پسند نہیں۔"

"بیٹے تم پڑھے لکھے ہو، عقل سے کام لو ـــــ تم اس دنیا والوں کی فکر کرتے ہو، جو فرشتہ خصلت پر بھی کوڑا پھینکتے رہے ہیں۔

تم اگر گہرائی میں جاؤ گے تو خود محسوس کروگے کہ میں کہاں تک درست ہوں۔ اب رہی دنیا والوں کی بات ـــــ تو یہ عین فطرت ہے، ویسے بے پر کی باتوں میں قوت پرواز نہیں ہوتی بس وہ تو فضا میں ہی بکھر کر رہ جاتی ہے۔"

"ممی کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ بھی میرے ساتھ ڈاکٹرز کالونی میں رہتیں،

ـــــ اس طرح اس غیر مہذب ماحول سے چھٹکارا بھی مل جاتا۔"

"نہیں بیٹے ـــــ یہ ممکن نہیں ـــــ اُن کی روح کو تکلیف ہوگی ـــــ اور پھر یہ احسان فراموشی ہوگی اور میں بھی اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔"

"میں جانتا ہوں ممی ـــــ آپ کو کس قدر اُن سے عقیدت رہی ہے۔"

"ہاں بیٹے، مجھے اُن سے بے پناہ عقیدت رہی ہے اور پھر وہ میرے رہبر اور محسن بھی تھے ـــــ۔

اُس وقت میں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی ـــــ ششماہی امتحان کے غیر متوقع نتیجے پر نہایت ہمدردی سے مجھے اپنے پاس بلوایا اور کہنے لگے:

"یوں تو تم کافی ذہین، تیز اور سمجھ دار ہو لیکن پھر بھی امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی کیلئے ایک گائیڈ کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ پائی سر!"

"تمہیں ایک اچھے ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھنا، تم سبھوں کی چھٹی کردو گی۔"

تب میرا سر ندامت سے جھک گیا اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

"وہ زمانہ شناس تھے ـــــ فوراً میرے بازو کو تھپتھپاتے ہوئے بولے ـــــ "تاجور اس میں رونے کی کیا بات ہے ـــــ میں جانتا ہوں کہ ٹیوشن کیلئے تمہارے پاس ـــــ۔

دیکھو ـــــ کل سے تم سلمیٰ کے ساتھ آجانا ـــــ پیسوں کی فکر نہ کرنا۔"

اور پھر اپنی سہیلی، سلمیٰ کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر میں نے ٹیوشن جوائن کر لیا ـــــ۔

استاد محترم بڑے مخلص اور ہمدرد انسان تھے اور وقت کے صحیح نباض بھی ـــــ میرے چہرے کو دور سے ہی پڑھ لیتے اور پھر میری ضرورتوں کو بغیر طلب کئے، کبھی کبھی تو میرے نوٹس میں لائے بغیر، پورا کر دیتے ـــــ

اس طرح میں ان کی شفقتوں، ہمدردیوں اور اعانتوں کے سائے میں
پروان چڑھتی رہی اور پھر میں نے ہائی اسکول کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن حاصل
کر کے سبھوں کی آنکھیں ہی خیرہ کر دیں ـــــ میں پورے ضلع میں اول آئی تھی۔
وہ خوش تھے کہ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور میں خوش تھی کہ ایک
مخلص انسان کے ہاتھوں سنور گئی ـــــ لیکن جس کی قسمت میں بگڑنا لکھا ہو اسے کون اور
کب تک سنوارے رکھ سکتا ہے ـــــ۔
میں جب ہائی اسکول کا امتحان دے رہی تھی ـــــ تو اس وقت پرائیوٹ
طور پر ایک اور شخص بھی امتحان دے رہا تھا ـــــ میں اس کی نگاہ سے خود کو بچا نہ سکی ـــــ
وہ مجھے اپنی اور کھینچتا گیا اور میں اپنی ہی اور سمٹتی رہی ـــــ پر معلوم نہیں ڈور کا سرا
کب میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں ڈھیلی پڑ گئی کہ اس نے اپنی شادی کا پیغام بھجوا دیا ـــــ
تمہارے نانا ایک معمولی راج مستری تھے کماتے تو کھاتے ورنہ بھوکے
سو جاتے۔
ایسے میں اُن کے لئے میری شادی کا پیغام آنا ـــــ وہ بھی بغیر جہیز کے،
مژدۂ جانفزا سے کم نہ تھا انھوں نے فوراً حامی بھر دی ـــــ
اور پھر میری شادی ہو گئی۔
لیکن تمہارے پاپا ـــــ اللہ معاف کرے ـــــ اول درجے کے شرابی نکلے۔
دن تو کورٹ میں سوتیلے بھائیوں سے مقدمے میں گزارتے اور رات شراب کی بوتلوں میں
ـــــ اس طرح ایک دن تمہارے پاپا اخبار کی موٹی موٹی سرخیوں میں لپٹے، زہریلی شراب
کی نذر ہو گئے ـــــ اور پھر میں اس سفید ساڑی میں سمٹ آئی۔
اُس دن میرے محسن، میرے رہبر، فرشتہ صورت لئے ملتجیانہ نظروں سے
مجھے گھنٹوں گھورتے رہے ـــــ زبان جیسے گنگ ہو گئی ہو ـــــ بس آنکھوں کے
سہارے مجھے نہارتے رہے۔ کبھی میری بیوگی کو ترس بھری نگاہوں سے دیکھتے تو
کبھی تیری معصومیت کو۔

مجھ پر تو جیسے غشی چھا گئی ـــــ میں اُن کا سامنا بھی نہ کر سکی بس بستر سے چمٹ گئی۔ روتے روتے میرا بُرا حال تھا آنکھیں سوج گئی تھیں اور ہمت بھی لوٹ سی گئی تھی۔ میں اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اپنی ہمت کو بھی سمیٹ نہ سکی۔

ـــــ اور شاید اُن کے اندر بھی میری سعیندی کی تاب لانے کی قوت نہ تھی۔ اسی لئے مجھ سے ملے بغیر چلے گئے ـــــ۔

لیکن میں ان کی شفقتوں اور عنایتوں کو بھول نہیں پا رہی تھی ـــــ میں جب بھی ٹیوشن کیلئے ان کے یہاں جاتی تھی تو میرا دل اُن کی سادہ زندگی کو دیکھ کر بھر آتا تھا۔ پر اُن کے ٹھوس اور مضبوط ارادوں کے سامنے، میری آنکھیں عقیدت سے جھک جاتیں ـــــ وہ اپنی بساط بھر دوسروں کی مدد کرتے، حق و انصاف کے لئے ہمیشہ لڑتے ـــــ

دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھنے والا شخص خود کتنا غمگین تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا یہاں تک کہ میں بھی ـــــ

ہاں میں صرف اتنا جانتی تھی کہ اُن کے پاپا بچپن ہی میں گذر گئے تھے اور امی نے بڑی جانفشانی سے اُن کی پرورش کی تھی۔

ان کی خشک اور بکھری زندگی کو، میں کہاں تک سمیٹتی اور تر کرتی ـــــ ویسے جب بھی اُن کے یہاں جاتی اُن کی بکھری کتابوں کو قرینے سے سجا دیتی ـــــ بستر کو جھاڑ دیتی اور پھر آتے جاتے، کبھی اُن کی فرمائش پر، کبھی خود سے، اپنے ہاتھوں ان کو چائے بنا کر پلاتی ـــــ وہ بہت خوش ہوتے اور کہتے ـــــ "تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے چائے میں آبِ حیات گھول لاتی ہو۔" اور پھر دعائیں دینے لگتے۔

ایک دن اچانک ان کی موت کی خبر ملی ـــــ ایسا لگا کہ جیسے سورج نے اچانک اپنا مُنہ بادل میں چھپا لیا ہو۔

میں افسردہ اور ملول اُن کے یہاں پہنچی ـــــ حاضرین میں رات کی سردی کا ذکر چھڑا تھا ـــــ سردی کی نصف رات تک مرحوم چھت پر نہ معلوم کیا کیا سوچتے

رہے تھے ـــــ صبح صادق اکڑے ہوئے پائے گئے۔

میں اپنے رہنما کی موت پر جیسے اندر سے ٹوٹ سی گئی ـــــ میں بھی سہمی سیدھی اُن کے کمرے میں پہنچی ـــــ اس وقت ایسا لگا کہ جیسے سبھوں کی نگاہیں مجھے ہی گھور رہی ہوں ـــــ چند ثانیے کے لئے ایسا لگا کہ جیسے میں ہی قاتل ہوں میرے ہی ہاتھوں اُن کا خون ہوا ہو ـــــ میں سمٹی سمٹائی، گٹھری بنی اُن کے بستر کے قریب بیٹھی تھی ـــ آنکھیں عقیدت و احترام سے اشکبار تھیں ـــــ میں آنکھوں کو بار بار خشک کرتی پر آنسو تھے کہ اُمڈتے چلے آرہے تھے ـــــ ابھی میں خود کو سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ چپراسی نے ایک رقعہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا ـــــ

یہ آپ کے نام چھوڑ گئے ہیں ـــــ۔

پرچے پر لکھا تھا:

"تاجو! میں اپنی زندگی تمہارے نام کئے جا رہا ہوں ـــــ للّٰلہ انکار کرکے رسوا نہ کرنا۔

اس طرح اُن کی اپنی زندگی تو ختم ہو گئی پر جو زندگی میرے نام کر گئے تھے وہ آج بھی باقی ہے ـــــ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی بیٹے کہ انھوں نے اپنے دفتری کاغذات پر نامزدگی کے خانوں میں میرے ہی نام کا اندراج کیا تھا ـــــ۔

میں خاموش تھی ـــــ اپنے محسن کے احسانوں میں دب کر کراہ بھی نہ پا رہی تھی۔ بس عقیدت سے آنکھیں نم تھیں۔

'دیکھو بیٹے! ـــــ ان کی قبر کو دیکھو ـــــ ٹھیک سینے پر یہ تناور درخت ـــ ایسا لگتا ہے کہ آج بھی انھوں نے اپنے مردہ جسم کو درخت کی توانائی کے لئے وقف کر رکھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی قبر پر تناور درخت ہی کی طرح آج میں بھی سرسبز و شاداب ہوں ـــــ۔

●●

سلمیٰ

"تو می ایکھونی باڑی چولے جاؤ۔" (تم اسی وقت گھر چلے جاؤ)

ہاسٹل انچارج کی اس ہدایت پر میں چونکا تو اس نے میرے ہاتھوں میں ایک ٹیلی گرام تھما دیا۔ جسے پڑھا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ مجھ پر کپکپی سی طاری ہو گئی ایسا لگا کہ جیسے زمین کانپ رہی ہو۔

میں نے ٹیلی گرام کی تحریر کو بغور پڑھا، کئی بار پڑھا، لیکن کئی بار پڑھنے سے بھی کہیں الفاظ اپنی معنویت کھوتے ہیں۔

"ناممکن" میں تقریباً چیخ پڑا۔

اور ٹیلی گرام کو مروڑتے ہوئے بڑبڑانے لگا ـــــ

"یہ کیسے ممکن ہے دوسروں کو سہارا دینے والی سلمیٰ خود کیسے بے سہارا ہو سکتی ہے"

میں نے شکستہ دل کے ساتھ فوراً رختِ سفر باندھا۔

سفید ساڑی میں لپٹی سلمیٰ ایک گوشے میں گم صم ایک خاموش مورت کی طرح کھڑی تھی۔ خاموش بالکل خاموش، جیسے اسکی قوتِ گویائی سلب ہو گئی ہو۔

وہی سلمیٰ جو قہقہے لگانے کو اپنی زندگی کا اٹوٹ حصّہ سمجھتی تھی۔ مچلنا، مٹکنا، اور شرارتیں کرنا، جس کی فطرت تھی۔

ہاں، وہی سلمیٰ جس نے کبھی، میری انگلی تھام کر مجھے دانش گاہ کے زینوں کو چڑھنا اور اترنا سکھایا تھا اسکی مخلصانہ رہبری میں ہی، میں نے چلنا اور سنبھلنا سیکھا تھا وہ ہمیشہ مسکرا کر مجھے زندگی کی پتھریلی راہوں پر گامزن رہنے کا مشورہ دیتی۔

لیکن آج شاید وہ مسکرانا بھول گئی تھی یا پھر ہنسی کے فوارے پر زمانے کی دھول جم گئی تھی یا حالات کے تھپیڑوں نے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔

اماں کے انتقال کے بعد میں نے نانا کی خواہش کے احترام میں ہی ننیہال میں رہنا پسند کیا تھا ویسے بھی اس وقت میں مٹی کا ایک تودہ ہی تھا، بنانے سنوارنے والوں نے جس صورت بہتر جانا، مجھے ڈھال دیا۔ میں تو بس اپنے کمہار کے سامنے مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

ابھی میں پرائمری درجے کے آخری زینے کو عبور ہی کر رہا تھا کہ اماں کا انتقال ہو گیا۔ پاپا نے دوسری شادی رچالی اور شاید یہی بات نانا کو ناگوار گزری وہ اپنی چہیتی اور اکلوتی بیٹی کی جگہ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتے تھے یا پھر ان کی دوررس نگاہ تھی کہ انھوں نے پاپا سے اُن کے نکاح ثانی سے قبل ہی صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

"علی بیٹے! مجھے تمہارے گھر بسانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن سوت کی گود میں اپنی تصوّر کے بچّے کی پرورش کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

نانا کے خیال میں تمام سوتیلی ماؤں کی کونپلیں اسی کیکئی سے پھوٹتی تھیں۔ جس نے رام کی زندگی میں اتھل پتھل مچادی تھی۔ جو بہر صورت نانا کو گوارا نہیں تھا۔ شاید اسی لئے وہ میری ننھی سی جان کو اپنی ناتواں کاندھوں پر بٹھائے اپنے ساتھ یہاں تک لے آئے جہاں انھوں نے میری سب سے پہلی ملاقات سلمیٰ سے کرائی تھی۔

سلمیٰ میرے ماموں کی شوخ اور چنچل بیٹی تھی یوں تو وہ ضدی طبیعت کی تھی پر دل کی بڑی کومل تھی۔

"سلمیٰ بیٹی! دیکھو تو کسے لایا ہوں۔" نانا نے آواز لگائی۔

سرخ اور سفید اسکول یونیفارم میں وہ بڑی جاذبِ نظر لگ رہی تھی ماموں کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی لاڈ پیار میں پلی تھی

"خالی ڈبہ" وہ مجھے دیکھتے ہی بڑبڑائی۔

واقعی میں اس وقت خالی ڈبہ ہی تھا —— بے مقصد، خالی —— بے ضرورت اپنے وجود کے بوجھ کو ڈھوئے پھر رہا تھا۔

"نہیں بیٹے، ایسا نہیں کہتے" نانا نے تنبیہہ کی —— "یہ تمہاری تصور پھوپھی کا بیٹا تصدیق حسن ہے۔ اب یہ یہیں تمہارے ساتھ اسکول میں پڑھے گا۔"

اور پھر وہ میری انگلی پکڑ کر درس گاہوں کی سیر کراتی رہی اور زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر بھی صراطِ مستقیم کا درس دیتی رہی۔ ساتھ اسکول لے جاتی اور ساتھ ہی لاتی۔ بڑی میٹھی میٹھی اور ڈھیر ساری باتیں کرتی۔

اچھی اچھی کہانیاں سناتی۔ اسے کہانیاں بہت ساری یاد تھیں۔ طوطا مینا سے لیکر راجہ رانی تک کی طویل کہانیوں کا سلسلہ اس کے ذہن میں ہر وقت موجود رہتا۔ کبھی کبھار تو خود ہی کہانیاں بھی گڑھ لیتی اور بڑے ہی لطیف پیرائے میں انھیں بیان کرتی۔ جس سے ذہن کو طمانیت ملتی اور دل کو فرحت بھی۔ چائے کی پیالی کی طرح کہانیاں بھی تو طبیعت کو فرحت بخشتی ہیں۔

وہ روز رات گئے تک کہانیاں سناتی اور جب میری آنکھیں اس کی کہانیوں کی طوالت سے بوجھل ہو جاتیں۔ تو آنکھوں میں نیند کا خمار دیکھ کر وہ مجھے اپنے بستر پر جانے دیتی۔ صبح تڑکے جب فجر کی نماز کے بعد نانا اسے جگاتے تو وہ مجھے بھی جگا دیتی اور پھر ہم اپنا اپنا سبق اسوقت تک رٹتے رہتے جب تک نانا باہر نہیں چلے جاتے تھے۔

میرے اسکول کی تیاری سے لیکر گھر کی تمام ضرورتیں وہی پوری کرتی۔ ممانی کے دو کڑوے بول سے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے لیکن سلمیٰ کی شفقت پر جان نچھاور کرنے کو جی چاہتا۔ سلمیٰ سے دھیرے دھیرے میری انسیت بڑھتی گئی۔ شاید اسی لئے مجھے اس سے الگ ہونے پر ایک پل بھی پہاڑ سا لگتا۔

جب وہ مادھیامک پاس کر چکی تو ماموں نے اس کی پڑھائی ختم کر دی اس وقت میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ تنہا اسکول جانا پڑتا تو بوریت ہونے لگی۔ اکثر اسکول ناغہ بھی کر جاتا جس کی وجہ سے ممانی سے ڈانٹ کھانی پڑتی۔ لیکن آنسو خشک کرنے کو سلمیٰ ہر وقت تیار رہتی۔ اپنے پاس بٹھاتی، میٹھی میٹھی باتوں سے دل کو بہلاتی۔ تب ممانی کی کڑوی کسیلی باتوں کا اثر زائل ہو جاتا۔ اور میں پھر تروتازہ ہو جاتا۔

اسکی قربت میں بڑی شیرینی تھی جسے پا کر میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ اپنے دکھ درد اور غم۔ اور کبھی کبھار تو وہ اتنی قریب آجاتی کہ اس کے جسم کی خوشبو سے میرے جسم میں سرسراہٹ سی ہونے لگتی اور وہ بلا جھجھک میری آنکھوں میں اترتی چلی جاتی۔ میں مارے خوف کے سہم سہم سا جاتا اور خود میں سمٹتا چلا جاتا لیکن وہ بلا خوف و خطر پھیلتی اور پھیلتی چلی جاتی

جوں جوں اس کے جسم میں گداز پن آتا گیا اس کی کہانیوں میں بھی بے باکی آتی گئی اب وہ اپنی ہی بنی ہوئی کہانیاں سنایا کرتی ـــ جو نسوانی جبلت کی منہ بولتی تصاویر لگتیں ـــ رومان تو جیسے اس کی روم روم میں بس گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اسکی کہانیوں میں کبھی منٹو کی "بو" ملتی تو کبھی عصمت کا "لحاف" اور کبھی تبسم کی "اترن"۔

وہ اپنی کہانیوں میں جہاں عورتوں کے گورے، سونلے چہروں کا ذکر کرتی وہیں چہرے کے نیچے اترتے ہوئے گول گداز سینے کے ابھار پر کنکری ضرور پھینکتی اور پھر نیچے اترتے اترتے ناف کی گہرائی اور اس کی بے تکی گولائی پر بھی تبصرہ کرتی۔ وہ کہانیوں میں کولہے پر کے تھرکتے ہوئے گوشت اور گول گول نیم عریاں بازوؤں کا بیان اس بے باکی سے کرتی کہ سننے والوں کی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں۔ اسکی لذیذ کہانیوں سے میرے اندر گدگدی سی پیدا ہو جاتی اور میرے رونگٹے تنتے جاتے ـــ اس وقت وہ ایک کوری چادر میں لپٹی تار تار سی دکھتی، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے جسم کے تنے ہوئے رونگٹے اپنے ہی جسم میں سمٹ آتے اور پھر میں بے جان سا ہو کر رہ جاتا۔

سلمیٰ کو نہ معلوم کیوں مجھ میں اتنی دلچسپی تھی کہ میرے میلے کپڑے دھونے سے لے کر آئرن تک کی ذمہ داری اس نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ میرے کھانے

پینے، سونے اور نہ معلوم کن کن چیزوں کا وہ خیال رکھتی۔ میں جب کبھی ممانی کی سختیوں سے تلملا اٹھتا تو وہ سلمیٰ ہی ہوتی جو اپنی قربت کا احساس دلا کر میرا غم دور کرتی۔

اس وقت اس کی قربت، اس کی پھوٹتی ہوئی سانسوں کی بھینی بھینی خوشبو مجھے بھلی لگتی۔ اس دن تو اس نے حد کر دی جب نکاح کی رات وہ سرخ جوڑے میں سجی، مہندی میں ڈوبی، ہلدی میں نہائی اور چندن کی خوشبوئیں لپیٹی میری تنگ و تاریک کوٹھری میں آئی اور کافی دیر تک میرے سر پہ ہاتھ پھیرتی رہی اور طرح طرح کی ہدایتیں دیتی رہی۔

"ممّی کی نرم گرم باتوں کو سہنا، کبھی ان سے الجھنا نہیں۔"،

"سونا تپ کر ہی کندن ہوتا ہے۔"،

"صبر سے کام لینا، صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا۔"،

"اور ہاں! اپنی تعلیم بہر صورت جاری رکھنا۔"،

"علم ہی کامیابی کا زینہ ہے۔"،

"میری خاطر، اپنی زندگی کو سنوار کر ہی دم لینا۔"

اور پھر ڈھیروں نصیحتوں کے بعد وہ سسرال چلی گئی۔

میں اس درمیان ہر لمحہ ٹوٹتا رہا، اس کی کمی محسوس کر کے بکھرتا رہا اور اس وقت اس کی کمی تو شدت سے محسوس کرتا جب ممانی کی آنکھوں میں غصّے کی بجلیاں مچلتیں اور وہ مجھ پر زبان کی لُو بن کر ٹوٹ پڑتیں۔ تب خشک بنجر زمین کے اس ٹکڑے پر ساون کی گھٹا بن کر چھانے والی سلمیٰ کی بہت یاد آتی۔

ماموں سنجیدہ اور خاموش طبیعت کے انسان تھے ہمارے درمیان آنا پسند نہیں کرتے تھے ہاں نانا کی حیات میں اگر ایسا کبھی ہوتا تو وہ اپنی کمزور ٹانگ ضرور اڑاتے۔ بھلے ہی وہ چند ثانیہ کے بعد خود ہی لڑھک جاتے لیکن زیادتی کی مخالفت مجاہدانہ طریقے سے کرتے۔

ماموں نے صحافت سے میری دلچسپی دیکھ کر مجھے مناسب تعلیم کیلئے کلکتہ بھیج دیا۔ اس طرح وہ ممانی کی زیادتیوں سے مجھے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے بھی بنگال کے اس احتجاجی شہر میں خود کو گم کر دینے میں ہی عافیت جانی۔ لیکن سلمیٰ کا پروقار چہرہ یہاں بھی میرے تعاقب میں تھا۔ یہاں کی خوبصورت بنگالی دوشیزاؤں کے چہرے پر اکثر اس کی صورت اُگ آتی۔

لیکن آج سلمیٰ کی صورت دیکھ کر میں گھبرا گیا، اداس صورت والی سلمیٰ، گم صم، بالکل مورت سی کھڑی تھی۔

اور اس مورت سے چمٹی ننھی سلمیٰ زار و قطار رو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ننھی سلمیٰ اپنی قد آور سلمیٰ سے چمٹی ہو۔ دونوں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ فرق صرف پختگی کا تھا۔ اس ننھی سلمیٰ کو کمہار نے ابھی صرف تراشا تھا۔ وقت اور حوادثِ زمانہ کی تپش میں اُسے تپنا باقی تھا ـــــ وہی بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، نکلتا قد، سرخ اور سفید اسکرٹ میں وہ اپنے وقت کی سلمیٰ ہی لگ رہی تھی۔

میں بے اختیار آگے بڑھا۔ ننھی سلمیٰ کو اپنی طرف کھینچا اور سینے سے لگا لیا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں انسیت کا اتھاہ ساگر موجیں مار رہا تھا۔

میں نے ایک بار قد آور سلمیٰ کے اداس چہرے کو بغور دیکھا اور پھر ننھی سلمیٰ پر اپنے حصار کی گرفت تنگ کر دی۔ ●●

فی اَمانِ اللہ

ناگہانی حادثے کی خبر ملتے ہی بوڑھی مرغی نے اپنے چوزوں کو پروں میں سمیٹ لیا تھا — چوزے بھی خوف کے مارے ماں کے پروں میں پوری طرح سمٹ آئے تھے بوڑھی مرغی مسلسل کاک کاک کیے جا رہی تھی — اچانک میری بیوی بلند آواز میں بڑبڑانے لگی۔

"آدمی ہو تو آپ جیسا، بھلا......"

"لیکن — آخر ہوا کیا؟ جو اس طرح میری آدمیت کو چیلنج کر رہی ہو۔"

"آپ کو الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے سے فرصت ملے تب نا۔"

"اوہو! فرصت ہی فرصت ہے، جب ہی تو الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا ہوں عجلت میں ہوتا تو خط مستقیم نہ کھینچ لیتا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو! تمہارے پلے کچھ پڑنے کو نہیں — بتاؤ! تم اس قدر لال پیلی کیوں ہو رہی ہو؟"

"آپ کا لاڈلا اب تک نہیں لوٹا۔"

"لوٹ آئے گا۔"

"لیکن کب؟ — گھر سے باہر جاتے ہوئے اس کے چہرے کی جو رنگت تھی،

پیشانی پر جو بل تھے، اس سے میں تشویش میں جکڑی جا رہی ہوں۔"

"اس میں تشویش کی کیا بات ہے۔؟"

"آپ کی سرخ آنکھوں اور کرخت لہجوں سے وہ بڑا سہم سا گیا تھا۔"

"اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں اُسے ہی تو دِکھا سکتا ہوں۔ تمہیں دکھانے سے تو رہا۔"

"آپ کو بس اپنی سُوجھتی ہے، میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔"

"فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اپنا لاڈلا ہوشیار ہے ـــ سورج ڈھلتے ہی لوٹ آئے گا۔"

مغرب میں سورج قہقہے لگاتا ہوا ایک اور دن کا سفر پورا کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گرتے گرتے ہوئے بادل کے آخری سرے پر خون کی قے کر دی گئی ہو۔ چھت پر سے میں نے دیکھا، پاس پڑوس کے بچے بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے میں نیچے اپنے کمرے میں آیا جہاں میری بیوی خوف کی دبیز چادر اوڑھے آ دھمکی۔

"خدارا! ذرا باہر کی زہر آلود فضا پر نظر تو ڈالیے۔" بیوی نے التجا کی۔

"باہر کی آلودگی کا مجھے اچھی طرح علم ہے، لیکن آپ کا لاڈلا گرو بوبٹ ہے، کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں، کہ آلودگی کے زغنے میں آجائے" میں نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری بے چینی اور بے تابی کا احساس نہیں۔" بیوی کی رونی صورت میری آنکھوں میں اتر گئی۔

"تم خواہ مخواہ توہم پرست ہوئی جا رہی ہو۔" میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

بوڑھی مرغی کی کاک کاک کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی، شاید بلا ٹل گئی ہو۔ ـــ چوزے بھی پھدکتے چہکتے نظر آ رہے تھے۔ مرغی اپنی چونچ میں دانہ چگ چگ کر چوزے کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سبھی چوزے ماں کی گرد چہک رہے تھے۔

ٹھیک اسی لمحے دروازے پر کسی کی آواز سنائی دی۔ شاید میری بیوی پڑوس کے بچوں سے لاڈلا کے بارے میں کچھ دریافت کر رہی تھی یا اس کے ہم عمر بچوں سے اس کی بابت کچھ جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"وہ ہم لوگوں کے سنگ نہیں تھا" سب بچے یک زبان ہو کر بول پڑے۔
"لیکن وہ اکثر تم ہی لوگوں کے ساتھ دیکھا گیا ہے"۔ بیوی اپنی باتوں سے اُن

پر رُعب ڈال رہی تھی۔

"وہ تو بڑی بڑی باتیں کرتا تھا" اُن میں سے کسی نے کہا۔

چوزے سارا دن دانہ چگتے، ساری رات ماں کے پیروں میں سمٹ کر رہتے تو

اُسے توانائی ملتی اور پھر دوسرے دن نئے حوصلوں کے ساتھ اُچھلتے، کودتے، پھدکتے اور پَر

پھڑپھڑاتے نظر آتے۔

میں بیوی کو کیسے سمجھاتا، کہ پرواز کی کوشش میں حوصلے کا عمل دخل ہوتا ہے،

خون کا نہیں۔ میں نے لاڈلا کو کچھ ناجائز تو نہیں کہا تھا لیکن پرواز کے لئے احساس کو جگانا بھی

تو لازمی تھا۔ اس میں برائی کیا تھی؟

"وہ لوٹ آئے گا" ــــ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"لیکن کب؟" ایک آواز ابھری۔

ٹھیک اسی لمحے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا لاڈلا آگیا ہے

اور پھر باورچی خانے میں جھن پٹک کی آواز ولے نے میری سمجھ کو مزید قوت بخش دی ــــ بیوی

کھانا پروس رہی ہوگی۔

بوڑھی مرغی اب چوزے پر غرّا رہی تھی۔ چوزے بھی اپنے پر پھیلائے قوت

پرواز کی مشق کر رہے تھے اس درمیان بوڑھی مرغی چوزوں کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دے

رہی تھی ــــ چوزوں کے قریب آتے ہی اُسے وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ چوزے ماں کے اس تیکھے

تیور سے الگ اڑان بھرنے کی مشق میں لگے ہوئے تھے۔ زمین سے اُٹھ کر تھوڑی دور اڑان لگانے

کی کوشش کرتے اور پھر زمین پر آگرتے۔

اس طرح تمام چوزے مختلف دِشاؤں کو اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

لیکن میری بیوی میری اُور سمٹ آئی اور نہایت عاجزی کے ساتھ کہنے لگی۔

"لاڈلا اب تک نہیں لوٹا"

مجھے بھی اب تشویش ہونے لگی، لیکن خاموش رہا۔

"آپ کتنے پتھر دل ہیں۔" اس نے ٹھوکا لگایا۔

"دل اور دل کی دھڑکنیں تو ایک جیسی ہوا کرتی ہیں، لیکن دل پر پتھر رکھنا اور بات ہے۔" میں آپ ہی آپ بُدبُدانے لگا۔

"ذرا سوچیئے! کہیں انجان راہوں میں نکل گیا تو اس کا لوٹنا کتنا دشوار ہوگا" بیوی نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"پہلی بار تو کوئی بھی راستہ آشنا نہیں ہوتا۔" میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"پھر راستے میں حادثے بھی تو بہت ہوتے ہیں۔" بیوی نے وہم کی ایک نئی لیپ لگادی۔

"حادثے سے تو چہار دیواری میں مقید شخص بھی محفوظ نہیں رہتا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بڑے کٹھور ہیں۔" بیوی کا لہجہ اب کرخت ہوگیا تھا۔

"میں اپنے محافظ پر حرف لگانا نہیں چاہتا ــــ جو ہم، تم اور سب کا محافظ ہے۔" میں نے درس دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن دل کا کیا کروں کہ مانتا ہی نہیں۔" بیوی نے مادرانہ شفقت اور ذہنی الجھن سے مجھے آگاہ کیا۔

"دل اور اس کی دھڑکن، جسم اور اس کی ریاضت، روح اور اسکی پاکیزگی ــــ یہ سب تو انسان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ان پر قابو پانے کیلئے، ان کا ایقان حاصل کرنے کیلئے ایک طویل صبر و تحمل کے دور سے گذرنا پڑے گا ــــ یہ سب اعتقاد مانگتے ہیں اور اعتقاد تجربے کی صداقت میں پنہاں ہے۔"

شاید میری بیوی کو نیند آگئی تھی۔

لاڈلا ایک نئے سفر پر نکل چکا تھا ــــ بے نشاں منزلوں کی جانب ــــ

لیکن بوڑھی مرغی کی کاک، کاک کی بازگشت اب بھی فضا میں سنائی دے رہی تھی شاید ناگہانی حادثے کی مخفی اطلاع اُسے مل رہی ہو ــــ۔

●●

مونس

غوث بنگالہ کا عرس اپنے شباب پر تھا۔

دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کی بھیڑ میں، مجھے قومی ایکتا کی شان نمایاں نظر آرہی تھی۔ یہاں بلا تفریق مذہب وملت سبھی زائرین شریک تھے اور سبھوں کی آنکھیں غوث بنگالہ کی عظمت کے آگے نم تھیں۔ فضا میں بھانت بھانت کی آوازیں گونج رہی تھیں جن میں خانقاہی گداگروں کی آوازیں سب پر بھاری تھیں۔

غوث بنگالہ کا یہ تجارتی شہر، جسے کالے ہیروں کا نگر بھی کہا جاتا ہے، کی رونق فروری کے اس آخری نصف حصے میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ ہر مکتبۂ فکر کے لوگ، خواہشوں کی جھولی پھیلائے، آنکھوں میں عقیدت کے پھول سجائے، غوث بنگالہ کی ڈیوڑھی پر ماتھا ٹیکنے یا پھر زیارتِ غوث کی خواہش میں مست نظر آتے۔ مگر سبھوں کے عقیدت کے اظہار کا طریقہ جدا جدا ہوتا۔

کچھ ماتھا ٹیکتے،

کچھ بوسہ لیتے،

اور کچھ غوث بنگالہ کے مزار پر پھیلے پھولوں کی چادر کا دامن پکڑ کر

زار و قطار روتے،

تو کچھ صرف فاتحہ خوانی پر قناعت کرتے۔

میں بھی فاتحہ خوانی کی غرض سے حاضر ہوا تھا لیکن صدر دروازے پر پہنچتے

ہی میری نگاہ خواتین کی صف میں کھڑی پونم سے جا ٹکرائی اور مجھے حیرت کے جھٹکے نے اس طرح

مفلوج کر دیا کہ ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ بلند، چوڑے چکلے صدر دروازے کو دو

حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ایک حصہ مرد کے داخلے کیلئے مخصوص تھا تو دوسرا حصہ عورتوں

کیلئے ــــــ لیکن اس فاصلے یا دوری کو صرف بانسوں سے ہی پاٹا گیا تھا۔ اسلئے دوسرے

حصے میں داخل ہوتی ہوئیں خواتین کو ہر کسی و ناکس دیکھ سکتا تھا حالانکہ میرا مقصد لطفِ دیدار

نہ تھا مگر غیر دانستہ طور پر اٹھی نظر جب پونم جی سے جا ٹکرائی تو میں سکتے میں آ گیا۔ اندر داخل

ہو ہی چکا تھا اس لئے فاتحہ کیلئے ہاتھ اٹھائے مگر دل و دماغ پر پونم جی ہی چھائی رہیں

جوں توں فاتحہ پڑھ کر باہر نکل آیا۔ اور صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر پونم جی کی آمد کا

انتظار کرنے لگا۔

پونم جی اور میں نے ایک عرصہ تک اپنا قیمتی وقت ساتھ ساتھ گزارا تھا۔

پونم جی سے میری پہلی ملاقات ویمینس کالج میں حادثاتی طور پر ہوئی تھی۔ میرا نیا نیا

Appointment Letter ہوا تھا۔ پرنسپل صاحبہ نے Appointment

دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ آپ پونم جی سے اپنا Routine لے لیں۔

میں Staff Room میں بیٹھ کر پونم جی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

اسٹاف روم کے چاروں طرف کی کرسیاں خالی پڑی تھیں صرف میرے سامنے کی کرسی پر ایک

صاحب جین پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس، مطالعہ میں غرق تھے۔ میں کمرے کی خاموش خاموش

سی فضا سے اکتا کر سامنے بیٹھے اس شخص کا جائزہ لینے لگا۔ روکھے سوکھے چہرے پر ستواں ناک،

سنولا رنگ، لمبے لمبے بال ـــ گویا کوئی بھی چیز قابلِ کشش نہ تھی نہ مردانہ وقار اور نہ ہی

نسوانی رنگ و روغن کی مہک، لیکن معلوم نہیں کیوں بار بار میری آنکھیں اس شخص کی

اور اُٹھ جاتیں اور سوکھے سپاٹ کھردرے چہرے سے ٹکرا کر خاموش لوٹ آتیں۔

پیون کی آمد پر میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی کرخت آواز پر میری آنکھیں پھیل گئیں۔

"پونم جی ـــــ آپ ٹیٹوریل (Tutorial) کلاس لیں گی یا بچوں کو نوٹس دے دی جائے، پرنسپل صاحبہ نے دریافت کیا ہے۔"

"پونم جی" ـ کی آواز پر میرے کان کھڑے ہو گئے اور احتراماً میں بھی کھڑا ہو گیا۔

"آپ پو ـــ نم جی ہیں؟"

"جی ہاں ـــــ کہئے کیا بات ہے۔"

"میں اتنی دیر سے آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا اور آپ سامنے بیٹھی ہیں، ـــ بات دراصل یہ ہے کہ پرنسپل صاحبہ نے آپ سے روٹین (Routine) کے سلسلے میں ملنے کو کہا تھا۔"

"اچھا ـــــ آپ ہی اردو کے نئے لکچرار (Lecturer) ہیں، نوشاہ خاور"

"جی ہاں! خاکسار کو ہی نوشاہ خاور کہتے ہیں۔" میں نے اپنا تعارف پیش کیا تو پونم جی دراز سے روٹین نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"تیسرا پریڈ (Period) آپ کا بھی لیزر leisure ہے۔"

"جی، بہت بہتر"

اور پھر پونم جی چلی گئیں لیکن میرے ذہن پر نسوانی خدوخال کی مردانہ ہیئت کا بوجھ کافی دیر تک برقرار رہا، گھر لوٹا تو بھیا کی سالیوں نے گھیر لیا۔ اس وقت میرا قیام بھیا کے سسرال میں ہی تھا۔

"کیسا رہا، کالج کا پہلا دن" سب سے چھوٹی سالی نے پوچھا۔

"اس چاکلیٹ ہیرو کی خوب آؤ بھگت ہوئی ہوگی" منجھلی نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"کچے کنوارے کو کس نے ویمنس کالج میں Appointment دے دی۔"
منجھلی اور چھوٹی کے بیچ والی کی آواز ابھری۔
ہاں بھائی! جو من بھائے کہتی جاؤ ـــــ میں سب کی سن لوں گا، کہ یہاں
میری کون سنتا ہے۔"
"کہئے ـــــ ہم سب سن لینگے" سبھوں نے کورس میں کہا۔
"کیا بتاؤں ـــــ آج میرے ساتھ ایک عجیب حادثہ ہوگیا" میں نے نڈھال
ہوکر کہا۔

"حادثہ" سبھوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"ہاں! اسے حادثہ ہی کہیں گے" اور پھر سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جس پر
سبھی ہنسنے لگیں ـــــ منجھلی اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی ـــــ "خاور بھائی، پونم تو میرے
ساتھ پڑھتی تھی لیکن اس وقت شلوار اور جمپر میں رہتی تھی۔ ہمیشہ الگ الگ سی رہتی۔ نہ
کوئی سہیلی اور نہ کوئی دوست، چپ چاپ خاموش رہنے والی پونم اب مردانہ لباس پہنتی ہے۔؟"
مجھے اس عجیب وغریب پونم جی میں دلچسپی پیدا ہوگئی ـــــ ارادتاً اپنے
لیزر کے اوقات پونم جی کے ساتھ گذارتا۔ اتفاق کہئے کہ Third period ان کا بھی آرام
کا ہوتا۔ وہ ایکونمکس Economics میں ایم اے تھیں اس کا تو پہلی ملاقات میں ہی علم
ہوگیا تھا۔

اس طرح ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور وہ تہہ بہ تہہ کھلتی چلی گئیں ـــــ۔
ایک دن بتانے لگیں ـــــ
"میری پیدائش کے بعد کافی ہنگامہ ہوا۔ کہتے ہیں لوگ جوق در جوق دیکھنے
کو آتے۔ تانتا بندھ گیا تھا گھر کے سبھی لوگ پریشان تھے ـــــ ہاہاکار سی مچ گئی تھی۔ بابا نادم
تھے تو ممی خفگی میں نیم پاگل ہوئی جا رہی تھیں اور گھر کے دوسرے بڑے بوڑھے، مرد عورت سبھی
حقارت کی نظروں سے میری اُور دیکھتے اور والدین کی قسمت کو کوستے۔
میں اس زہریلی فضا میں پروان چڑھتی رہی کہ ایک دن گاتی اور تھالی بجاتی

چندا بائی نامی ایک مرد نما عورت میرے گھر آئی جس سے گھنٹوں میری ممی اور ڈیڈی باتیں کرتے رہے اور پھر جب وہ اٹھی تو اس مصیبت کی گھڑی کو بڑی شان سے اپنے کاندھے پر بیٹھائے سیجن پور لے آئی۔

چندا بائی سیجن پور کی نامی گرامی بائی تھی۔ شادی بیاہ، جنم دیوس اور دیگر تقریبات میں گاتی بجاتی۔ اپنی جماعت کی سربراہ بھی تھی لیکن تھی بڑی رحم دل اور کومل احساس والی۔

میری آرزو منت پر، چندا بائی نے میری پرورش کا انتظام شہر میں کروایا۔ ـــــ ابتدائی تعلیم اچھے اسکول میں دلوائی پھر بی اے اور ایم اے کروایا۔ کبھی بھی اپنے پرانے خیالات مجھ پر جبراً تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ جب، جس وقت، جس چیز کی ضرورت محسوس کرتی وہ حاضر کر دیتی۔

مجھے ممی، ڈیڈی کلے تقریباً نفرت سی ہو گئی تھی اور سب سے بڑا دشمن میں اپنی قسمت کو سمجھتی تھی لیکن چندا بائی کی تدبیر ہی کہئے کہ اچھی تعلیم دلا کر میری تقدیر کی لکیریں ہی بدل دیں۔"

اس طرح پونم جی پوری طرح کھل گئی تھیں اور میرے لئے قابل قدر شخصیت بن گئیں تھیں۔ ایک ہمدرد اور مونس کی ضرورت کو محسوس کر کے ان کے قریب سمٹ آیا۔ انکی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا۔ انھیں ہر وقت خوش دیکھنا چاہتا اور ان کو ہنسنے ہنسانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا۔

ایک دن غیر ارادی طور پر اپنی نئی رہائش گاہ کی تلاش کا ذکر چھیڑ دیا ـــــ "آخر کب تک بھیا کے سسرال والوں پر بوجھ بنا رہوں، اگر کوئی معقول کمرہ کرائے پر مل جاتا تو شفٹ کر جاتا۔"

پونم جی بے اختیار بول اٹھیں ـــــ "ایمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ میرے کمرے میں رہ سکتے ہیں اسٹاف کوارٹر ملتے ہی شفٹ کر جائیے گا۔"

میں نے بھی بہتر سمجھا ـــــ اس طرح ان کے زخم پر قریب سے پھاہا رکھنے کا موقع ملے گا۔ اور پھر ان کے دکھ درد کے مداوا کو ہی اپنا شیوا بنا لیا۔ جب کبھی بھی انھیں اداس دیکھتا

میں چٹکلے کا دفتر کھول دیتا اور پونم جی ہنسی ہنس کر بے حال ہو جاتیں۔ وقتی طور پر ہی سہی کرب سے طرب کی اور کھینچ آتیں۔

لیکن اس روز جب میں کالج پہونچا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی — دیواروں پر چسپاں عریاں نعروں سے میں بوکھلا گیا۔ ایسا لگا کہ میں دانش گاہ نہیں بلکہ کسی کوچۂ بدنام میں آ گیا ہوں۔ شاید میرے پیروں تلے کی زمین ہی سخت ہو گئی تھی ورنہ ضرور زمین میں دھنس کر خود کو فنا کر لیتا۔

"پونم جی — جواب دیجئے۔!" دیوار کی ایک جانب لکھا تھا۔

○ "نوشاہ خاور سے آپ کا کیا سمبندھ ہے؟"

○ "ھ، م کی شناخت پر یہ کاری ضرب کیوں؟"

○ "کالج کیمپس میں ایسی بے ہودہ حرکتیں نہیں چلیں گی۔!"

اور دیوار کی دوسری طرف کی تحریر تھی —

○ "نوشاہ خاور — ہوشیار!"

○ "مرد، عورت کی صحبت برداشت لیکن یہ مخنّث کی، ممکن نہیں!"

○ "یہ کرپشن ہے اسے ختم کرنا ہو گا"

○ "نوشاہ، خاور ہو سکتا ہے مگر خاور پونم جی کا نوشاہ! ہرگز نہیں"

پرنسپل صاحبہ کے دفتر میں ہم دونوں کی طلبی ہوئی اور کالج کے باہر دیواروں پر چسپاں گندی تحریروں کی بابت بازپرس کی گئی۔ ہم دونوں اپنی اپنی صفائی میں گھنٹوں بولتے رہے۔ انتظامیہ کو تشفی بخش جوابات دیتے رہے۔ انتظامیہ تو مطمئن ہو گئی —

لیکن اپنے آپ کو میں مطمئن نہ کر سکا۔ شاید پونم جی بھی اندر سے پشیماں پشیماں سی تھیں رات گئے تک ہم دونوں الگ الگ مخالف دشاؤں میں بڑھتے چلے گئے کہ آنکھیں تھک گئیں اور بوجھ سے نڈھال آنکھوں کو کب نیند نے آ دبوچا علم نہیں۔

صبح نیند ٹوٹی تو کمرے میں، میں تنہا تھا۔ پونم جی جا چکی تھیں —

اس دن سے آج تک ان کی تلاش میں ذہنی طور پر سرگرداں رہا کہ آج اچانک غوث بنگالہ کے

طفیل صدر دروازے پر پونم جی نظر آگئیں۔

پونم جی صدر دروازے سے نکل کر، اپنے پیروں میں سینڈل ڈال رہی تھیں کہ میں ان کی اور بڑھ آیا۔ سفید پاٹ دار ساڑی میں تیکھے خدوخال کی ملاحت میں اب کمی آگئی تھی۔

"غاور جی! آپ یہاں ـــــ" وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئیں۔

"ہاں، کلکتہ جا رہا تھا کہ دل میں غوث بنگالہ کی عقیدت نے جوش مارا اور اتر گیا کہ زیارت کرتا چلوں۔ اسے اتفاق ہی کہئے کہ آپ کا دیدار ہو گیا۔"

لیکن آپ اور یہ ـــــ جین پینٹ کی جگہ ـــــ یہ سفید پاٹ دار ساڑی ـــــ میری سمجھ میں بات نہیں آرہی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ؟ اور پھر اس رات اچانک مجھ سے ملے بغیر کمرے سے غائب ہو گئیں۔ میں تو سمجھا کہ زمین کھا گئی یا کہیں آسمان تو نہیں نگل گیا۔

آپ کے اتنے سارے سوالوں کا جواب اس ہنگامے میں ممکن نہیں۔ آیئے پہلے خاموش فضا کی تلاش میں آگے بڑھیں کہ اس ہنگامی صورت میں اپنی اصلی صورت کون دکھا پائے گا۔

اور پھر ہم دونوں خاموشی میں اتر آئے۔ شہر کے ہنگامے سے دور ـــ جہاں دور دور تک خاموشی ہی خاموشی تھی۔

اس رات شاید آپ کو نیند آگئی تھی لیکن میری آنکھوں کی نیند اور دل کا چین صبح کے ہنگامے کی نذر ہو گئے تھے۔ اس رات تاریک کمرے میں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی لیکن باہر بجلی کڑک رہی تھی اور اس کی گھن گرج سیدھے میرے دل میں اتر رہی تھی۔ میرے اندر آپ کی انسیت، محبت اور شفقت دھاڑیں مار رہی تھیں۔ اپنے مونس کو سرِ عام بدنام ہوتا دیکھ کر میں اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی کہ شب کے آخری پہر میں چندا بائی کا ایک قاصد آیا اور کہنے لگا ـــــ "چندا بائی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ یہ دو پلے کی مہمان ہیں سواری بھیج کر آپ کو فوراً بلوایا ہے۔"

میں اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ اپنے محسن بائی کی ہمدردی نے مجھے چاروں اور سے گھیر لیا۔ تب میں ان کے احسانوں کی کرچیوں سے بری طرح گھائل ہو گئی ـــــ ممی، ڈیڈی

نے خاندان کے جھوٹے وقار کی اوٹ سے جو زناٹے دار طمانچے لگائے ـــ تھے اس کی بازگشت میں، فضا میں ابتک سن رہی تھی۔ معاشرتی حیوانوں کی چیخ و پکار شیشہ بن کر کانوں میں اترنے لگیں۔ تب مجھے چندا بائی کا پلہ بھاری نظر آیا ـــــ سوچا اس طرح آپ کے خلوص کو بھی اذیت سے پاک رکھ سکوں گی۔

اور جب وہاں پہنچی تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا ـــــ۔

چندا بائی آخری ہچکی لے رہی تھی مجھے دیکھتے ہی قریب بلایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر زار و قطار رونے لگی۔ صرف آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لب خاموش تھے۔ پھر ہچکیوں کے درمیان موروثی جائداد سونپتے ہوئے اپنی شفقت اور محبت کا واسطہ دیکر سارا بوجھ میرے کاندھے پر ڈال دیا۔

یقین کیجئے اس وقت ایک طرف آپ کی انسیت میں لپٹی خلوص کی چادر تھی تو دوسری طرف ان رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی سرخی میں چندا بائی کا قرض، کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا ـــــ میرے مولسی، میں بہت مجبور تھی" اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی ـــــ "خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، اپنی کہیئے ـــــ شادی وادی کی کہ نہیں یا پھر بھائی کے سسرال پر ہی تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔"

"جن پہ تکیہ کیا وہی پتے ہوا دے گئے" ـــــ مگر یہ بات زبان پر ہی اٹک کر رہ گئی اور دل ہی دل میں، سوچ کر رہ گیا ـــــ "جب جزوی ساتھی ہی راس نہ آیا تو جیون ساتھی چہ معنی دارد ـــــ"

●●

مرثیۂ انسانیت

تاریکی چھٹنے اور پو پھٹنے کا درمیانی وقفہ تھا۔

زور کی بجلی کڑکی اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ بجلی کی کڑک سے میری نیند ٹوٹ گئی۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے جھنگلہ سے باہر کی اور دیکھا۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ بالکل اندھیرا، گھپ اندھیرا، چاروں سمت سیاہی ہی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا لگا کہ ابھی نصف رات باقی ہے۔ لیکن دیوار گھڑی پر میری نظر گئی تو فجر کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔

جھنگلے کو بند کر کے میں دوبارہ بستر پر لوٹ آیا ـــــ لیکن نیند اُچٹ چکی تھی، کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا لیکن جس کروٹ بھی ہوتا بے چینی اپنی جگہ ہوتی۔

ٹھیک اسی وقت پیٹ میں میٹھے میٹھے درد کا احساس ہوا۔ پھر سارے جسم میں تناؤ سا محسوس کرنے لگا، آنتوں میں سوزش ہونے لگی۔ اندرونی حدت سے جلن سا محسوس ہونے لگا۔ گیس کا احساس ہوتے ہی شکم کے اندرونی حصوں میں تناؤ اور کھنچاؤ محسوس کرنے لگا۔ ایسا گمان گذرا کہ میرا وجود ہی کانپ رہا ہو۔

پیٹ کے درد میں شدت آتی گئی۔ پیٹ کے اندر کے نظام میں اتھل پتھل مچ گیا تھا، جیسے کوئی انقلاب برپا ہو گیا ہو، پھر نعروں کی بازگشت کانوں کو سنائی دینے لگیں۔ تب ہی نتھنوں میں انقلابی دھماکوں کی بارودی بو گھسی آئی۔ جس سے مجھے ابکائی سی آنے لگی اور پھر ڈھیر سارا کل کا کھایا ہوا فرش پر اگل دیا۔ سڑیل بو سارے کمرے میں پھیل گئی۔ میں گھٹن سی محسوس کرنے لگا، تبھی ایک سایہ ابھرا۔

"تم کون ہو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں تمہارے اندر کا وہ ہوں"۔۔۔ اجنبی نے کہا

"وہ کون؟" میں نے تعجب سے کہا۔

واہ بھئی! اپنے اندر کے "وہ" کو بھی نہیں جانتے"۔ اس نے حیرانی سے کہا۔

واقعی میں اپنے اندر کے وہ سے گھبرا گیا تھا۔۔۔ دبلا، پتلا، لاغر، منحنی خدوخال کا شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"تمہارے اندر کی خوابیدہ حس کو جگانا چاہتا ہوں"۔ اجنبی نے گول مٹول سا جواب دیا۔

اور جب میں جاگا تو وہاں کوئی نہ تھا۔۔۔ میں بستر پر تنہا تھا، اجنبی کی شبیہہ فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں نے جنگلہ کھول کر باہر دیکھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ گھن گرج کی فضا اب تک قائم تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بارش اس بار برس کر مدتوں نہیں برسے گی۔

میرا حلق سوکھنے لگا۔ تو میں نے میز پر رکھے جار سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ ابھی ہونٹ میں لگا بھی نہ پایا تھا کہ شیشے کے شفاف گلاس میں وہی اجنبی نظر آیا۔

"تم یہاں، اس چھوٹے سے گلاس میں کس طرح سمٹ آئے"۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"میں چھوٹی سے چھوٹی شئے میں بھی سما سکتا ہوں"۔ اجنبی نے سر اونچا کر کے کہا۔

"تم مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو" میں نے وضاحت چاہی۔

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو ـــــ میں تو صرف تمہارے اندر کی خوابیدہ حس کو جگائے رکھنا چاہتا ہوں"۔ اجنبی نے کہا۔

"تم کو یہ حق کس نے دیا" میں نے چیخ کر کہا۔

"دراصل میں تمہارے اندر کا آدمی ہوں"۔ اجنبی نے وضاحت کرنی چاہی۔

"اندر کا آدمی"، کیا اس باہر کے آدمی کے اندر بھی ایک آدمی رہتا ہے"۔ میں بیچ میں بول اٹھا۔

"ہاں ہر انسان کے اندر ایک آدمی چھپا ہوتا ہے لیکن انسان دنیا میں آکر ہوس پرستی اور خود غرضی میں کچھ اس طرح الجھ جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر کے آدمی سے بالکل غافل ہو جاتا ہے یا پھر اپنے ہاتھوں اسے تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیتا ہے"۔

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ "کیا انسان اپنے اندر کے آدمی کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے"۔

"ہاں، اس فانی دنیا میں نام و نمود کی خاطر انسان، اپنے اندر کے آدمی کو گہری نیند سلا دیتا ہے تاکہ خود کامیابی کی سر بفلک چوٹی پر اپنی مرضی کا جھنڈا گاڑ سکے۔ دراصل انسان فاتح کی حیثیت سے جینا چاہتا ہے، خودی کو مار کر ہمیشہ خود کو بلند دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اپنے حریف یا مد مقابل کو زک دینے میں ہی اپنی کامیابی سمجھتا ہے"۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ـــــ کیا ہر انسان اپنے اندر کے آدمی کو مار کر ہی بلندی پر پہنچتا ہے"۔

"دراصل انسان کے اندر خود نمائی جب عود کر آتی ہے تو وہ اپنے اندر کے آدمی سے ڈر جاتا ہے اور اسے راہ کا کانٹا تصور کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ اندر کا آدمی ہی ہوتا ہے جو انسان کو زندگی کے گوناگوں تقاضوں کے اخلاقی قدروں کی حدود میں رہ کر

اس کا مہذب حل بتا تا ہے جو یقیناً وقت طلب کرتا ہے۔ لیکن انسان فوراً مقصد برآری چاہتا ہے تب وہ اپنے اندر کے آدمی کو اپنا رقیب سمجھ بیٹھتا ہے اور اسے گہری نیند سلا دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔"

"تم لغو بکتے ہو ـــــ انسان، انسان ہوتا ہے، کیوں اپنے اندر کے آدمی کو میٹھی نیند سلانے لگا۔"

"تم اسے انسان کہتے ہو ـــــ جو اپنی بقا اور اپنی شناخت کے لئے دوسروں کی شناخت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے، صرف چند ووٹوں کی خاطر، وہ شطرنج کے شاطرانہ چال چلنے والا کرتب باز ہو سکتا ہے انسان نہیں۔"

"وہ" یعنی میرے اندر کا آدمی پانی میں تحلیل ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر پانی کو فرش پر انڈیل دیا۔ میں نے تازہ ہوا کی خاطر جنگلہ کھول دیا ـــــ بارش اب بھی ہو رہی تھی رفتار میں البتہ کچھ کمی آگئی تھی لیکن وقفے وقفے سے بجلی کی کڑک صاف سنائی دیتی۔

میں ریڈنگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ اور کتابوں کو غیر ارادی طور پر الٹنے پلٹنے لگا۔ اچانک زور کی بجلی کڑکی در و دیوار جیسے لرز اٹھے ہوں اور پھر ایک چھناکے کے ساتھ سنگھار دان کا شیشہ گر کر فرش پر چور چور ہو گیا۔ شیشے کے چھوٹے بڑے مختلف ٹکڑے فرش پر بکھرے تھے اور فرش پر بکھرے ہر چھوٹے بڑے ٹکڑے میں میرے اندر کا "وہ" جھانکتا نظر آرہا تھا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ اس کی صورت مجھ سے کتنی مناسبت رکھتی ہے۔

"تمہاری صورت مجھ سے بہت ملتی ہے۔" میں نے اپنے اجنبی سے کہا۔

"میں تمہاری صورت میں ہی جیتا ہوں، میری اپنی کوئی شکل نہیں۔" اجنبی نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"تو تم تو میں ہی ہوئے۔" میں نے کہا۔

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن ہم دونوں میں بہت فرق ہے۔ اسپین کے

اس فلاسفر کی مہربانی ہے کہ اس نے ہم دونوں کی حد فاصل کی پہچان کرادی۔ تم، تم ہو اور میں، میں ہوں۔ اب تم جو انسان ہو کر حیوانی حرکتیں کرتے ہو وہ میں نہیں کر سکتا۔"

"حیوانی حرکتیں —"

"وہ، کیسے"

"عفریت کی طرح، بربریت کا ڈھول بجانا — ننگی اور برہنہ ٹانگوں کی عکس بندی کرنا — حیوانیت نہیں تو کیا — حیوان ناطق ہو تم،

اور یقین کرو یا نہ کرو — جب جب اور جہاں جہاں انسان نے اپنے اندر کے آدمی کو کچلا ہے وہاں وہاں زمین اسے نگل گئی ہے۔ کروڑوں برس پہلے بھی بربریت کے ننگے ناچ کا اسی طرح اہتمام ہوا کرتا تھا تو قدرت نے اس وقت کے تمام جانداروں جانوروں، درختوں اور پودوں کو مردہ کر ڈالا اور پھر ان کے مردہ جسم کو کیچڑ اور دلدل کے ساتھ سمندر کے نیچے جذب کر لیا جہاں اس قسم کی چیزیں تہ بہ تہ ایک دوسرے پر جمع ہوتی گئیں اور پھر سمندر کے نیچے اس طرح دبتے دبتے یہ مردہ جسم ایک زمانے کے بعد کالے گاڑھے رنگ کی معدنیات میں بدل گیا۔

تم بھی اسی طرح ختم کر دیئے جاؤ گے اگر خود کو نہیں سنبھالا، خود کو نہیں پہچانا تو مٹ جاؤ گے — نہ تم باقی رہو گے نہ تمہاری داستان — کہ زمین میں دراڑیں پڑ جائیں گی، شہر کا شہر تباہ ہو جائے گا۔ آبادی ویران ہو جائے گی۔ گاؤں اور شہر کو دیو نگل جائے گا۔ اوراق کے اوراق بھرے پڑے ہیں کہ تب زمین کی سطح ناہموار ہو جائیگی، زمین کی خشکی کو سمندر نگل جائیگا" — اور پھر شیشے میں، شیشے کے ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں، میں تنہا رہ گیا۔ میں گھبرا کر کرسی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔ بارش کھم چکی تھی، سویرا ہو چکا تھا۔ میں ٹی وی آن کر کے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا، صبح کی نشریات میں خبریں نشر کی جا رہی تھیں۔

زلزلے کی المناک خبر سماعت سے ٹکرائی — شہر میں بھیانک زلزلے کے سبب ہزارہا افراد ہلاک، متعدد قصبات اور مواضعات صفحۂ ہستی سے نابود — شہر کے شہر، گاؤں کے گاؤں زمین دوز —۔

نِجات

ادھر کچھ دنوں سے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اٹھتے، بیٹھتے سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے ـــــ ہر ساعت وہ ایک غیر مانوس اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ حقیقت سے نا آشنا اندر ہی اندر سلگ رہا تھا ـــــ وہ محسوس کرتا کہ کوئی سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک پل وہ ایسا سوچتا کہ کہیں یہ اُس کا اپنا ہی سایہ تو نہیں جو حالات کی روشنی میں بڑھ اور گھٹ رہا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے ایک اور سایہ ابھرتا جو پہلے کا متضاد نظر آتا، تو اس کا وہم چکنا چور ہو جاتا۔ سائے دو تھے اور وہ یکا و تنہا ـــــ مجبور و بے بس ـــــ وقت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہا تھا۔

پہلا جس قدر سفید تھا دوسرا اسی قدر سیاہ ـــــ حرکات و سکنات سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہی دکھائی پڑتے۔ وہ تو خود کو سیاہ و سفید کے نرغے میں مرغِ بسمل کی طرح پھڑپھڑاتا، نیم جان سا محسوس کر رہا تھا وہ اس طرح سفید و سیاہ کی بے جا مداخلت سے پریشان تھا۔ پر مرتا کیا نہ کرتا، خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتا رہا مگر اب۔ برداشت پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ دخل در معقولات کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سیاہ و سفید کو کیا یہ علم نہیں

کہ کسی کی نجی زندگی میں دخل دینا غیر اخلاقی فعل ہے وہ یہ سوچ کر ہی اپنی پر وقار شخصیت کو بہلا رہا تھا۔

وہ اب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور وقفے وقفے سے اپنی نوٹ بک میں کچھ اندراج بھی کرتا جا رہا ہے کسی امتحان کی تیاری کیلئے! ہونہار طالب علم کی طرح۔

وہ سہم سا جاتا کہ کہیں کاروباری حریف کا بھیجا ہوا خفیہ جاسوس تو نہیں جو میری کاروباری بلندیوں کی نوک و پلک پر کاری ضرب لگانا چاہتا ہو۔

اس روز رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو بیگم اس کی پریشان صورت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ ہونٹوں پر فکر کی موٹی موٹی پرت جمی ہوئی تھی، اور آنکھیں حیرت سے باہر نکلی چلی آ رہی تھیں۔ اس سے قبل، کبھی بھی اس نے اپنے خاوند کو اتنا نڈھال اور پژمردہ نہیں دیکھا تھا۔

"حالات سے لڑنا تو یہ اچھی طرح جانتے ہیں پر آج ایسی کون سی آفت ٹوٹ پڑی کہ اتنے حواس باختہ ہیں۔" اسکی بیگم دل ہی دل میں بڑبڑائی کہ زخموں کو کرید کر وہ اپنے خاوند کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اور وہ بھی اپنی پریشانی بیگم پر کھولنا نہیں چاہتا تھا شاید اسی لئے جیب سے رومال نکال کر چہرے پر پھیلی پریشانی سے گوندھی اور ابھری بوندیں خشک کرنے لگا۔

بیگم کے اصرار پر جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ دستر خوان پر تنہا نہیں ہے بلکہ سیاہ و سفید بھی ہمراہ ہیں اس کے ساتھ ساتھ لقمے کی نمکینیت کو وہ لوگ بھی حلق سے نیچے اتار رہے ہیں وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوا تھا اور پھر جلدی جلدی دو چار لقمے ہی کھا کر اُٹھ گیا۔

عادت کے مطابق دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد جب وہ بستر پر گرتا تو نیند فوراً اُسے آ دبوچتی ــــ لیکن آج نیند اُچٹ سی گئی تھی۔ ساری رات وہ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا پر جس کروٹ بھی ہوتا اسے یہ احساس بُری طرح جھلساتا رہا کہ بستر پر بیگم کے علاوہ سیاہ و سفید بھی موجود ہیں۔ اسکی موجودگی کے احساس سے اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ سہم سا

گیا اور پھر بیگم سے کھینچتا خود میں سمٹتا چلا گیا۔ بیگم اس کی اس حرکت پر حیران تھی ایسی تھکاوٹ پر تو وہ اکثر اسے سینے سے چمٹا کر اپنی ساری گرمی سینہ بہ سینہ اس پر اتار دیتے۔ تب ہی بیگم شاید رنجیدہ ہو کر سو گئی۔ لیکن وہ جاگتا رہا بستر پر آنکھیں کھولے، وہ اسوقت تک ان دونوں کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا جبکہ آنکھیں خود اپنی اندرونی حدت سے اُبال کھا کر پیالوں سے باہر نکل نہ آئیں۔

وہ اپنی بیگم پر اپنے احساسات کو تھوپنا نہیں چاہتا تھا کہ احساسات تو جدا جدا ہوا کرتے ہیں وہ کرب کی صلیب پر تنہا لٹکا ساری رات تڑپتا رہا۔ اس کو ایسا لگا کہ اس کا وجود کھونٹی میں ٹنگے موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھل کر فرش کی دھول میں مل کر اپنی ہیئت کھو رہا ہے۔

دوستوں کو اس کی اداسی پر ترس آ گیا۔ شاید اسی لئے دوستوں نے اپنے اپنے مشوروں کی فہرست اس کے سامنے پھیلا دی۔

"تمہیں وہم ہو گیا ہے اور شاید وہم کے معالجے میں تو حکیم لقمان بھی بے بس رہے۔"

"کسی اچھے مولوی کو دکھاؤ، ہوائیں پڑ گئے ہو۔"

"جنسی نا آسودگی کے سبب بھی ایسا ہوتا ہے، کسی اچھے گائنوکولوجسٹ سے ملو۔"

"ارے یار نفسیاتی مرض کے شکار ہو، ویدراہی کے نسخے پر عمل کرو ——

شاہاکاری ڈش کو اپنا مینو بنالو، نمک کو منہ نہ لگاؤ، نہار منہ ٹھنڈا پانی پیو، گرم دا دن سے بچو، روز ٹھنڈے پانی سے غسل کرو۔ بھگوان نے چاہا تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

کچھ نہ بن پڑا تو احباب اپنے اداس دوست کو محفل کی رنگینی میں اتار لائے۔

بازار حسن کی رنگین اور حسین محفل میں بھی وہ بجھا بجھا سا رہا کہ یہاں بھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دامن کسی خاردار جھاڑی سے الجھ گیا ہے۔ اور سفید پوش اسکے سامنے منہ لٹکائے کھڑا ہے اور پاس ہی سیاہ پوش مسکرا رہا ہے۔ اس کی تیزابی مسکراہٹ سے اسکا جسم جھلسا ہوا جا رہا تھا۔ اسوقت سیاہ پوش کی نیلی آنکھیں کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھیں تب وہ خود میں سمٹ آیا، گھونگھے کی طرح، کہ جب بھی وہ پھیلنا چاہتا سیاہ و سفید پوش حرکت میں آ جاتے۔

اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز بھی جب وہ ایک کمزور نحیف شخص کو اپنے کاندھے کا سہارا دیئے 'کرنیلی سڑک' پار کر رہا تھا تو سیاہ و سفید پوش کے چہرے کا روغن کچھ زیادہ ہی اتر گیا تھا لیکن اس کے برعکس سفید پوش کا چہرہ اسکی آنکھوں کی طرح پُرنور تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ سفید پوش پوری طرح اس پر پھیلتا جا رہا ہے — اس طرح کے حادثات بارہا اس کے ساتھ ہوتے رہے اور وہ تنہا اسے جھیلتا رہا — کبھی کبھی تو وہ سوتے میں بھی سفید و سیاہ پوش کے درمیان گھائل پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا اور پھر دوسرے ہی لمحہ ایک چیخ بلند ہوتی، اس کی نیند ٹوٹ جاتی — تب سارے جسم میں کپکپی سی طاری ہو جاتی، آنکھیں تربتر ہوتیں اور جسم ہلکا محسوس ہونے لگتا، جیسے وہ ابھی ابھی غسل کر کے اٹھا ہو، بالکل تروتازہ نظر آتا۔

کبھی سفید پوش سینے پر سوار ہوتا تو کبھی سینے سے چمٹائے بے اختیار اسے پیار کرتا نظر آتا تو کبھی سیاہ پوش اپنی چنگل میں اٹھائے گھائل کر دینے والے ناخنوں سے اسے چھیڑتا ہوتا تو کبھی شفقت نچھاور کرنے والی ممتا کی صورت نظر آتا۔ وہ سفید پوش کی روشن روشنیوں اور سیاہ پوش کی تاریک راہوں کے درمیان جھول رہا تھا بے بس — سفید پرندے کی طرح۔

تب ایک دن اس نے حالت اضطرار میں اپنی آنکھیں موند لیں اور وقت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا — اور جب وقت کے تھپیڑوں نے دوبارہ اسے فرش پر پھینکا تو اس کے سر پر پرکھوں کی ٹوپی تھی۔ سر سجدے میں تھا اور مغفرت کی گریہ وزاری زبان پر جاری تھی۔

آسمان بھی مہربان تھا فرش پر مینھ برسا اور وہ میٹھی نیند سو گیا — نیند ٹوٹی تو آنکھوں میں اتنی روشنی اتر آئی کہ وہ اپنی ذات کے اندرونِ خانہ کی سات تہوں کو روشن دیکھ رہا تھا لیکن سیاہ و سفید کہیں بھی نہ تھا۔

●●

وہ سات دن

زندگی ایک ڈرامہ ہے اور ہم سب اس کے کردار۔ وہ بھی زندگی کے اس ڈرامے کا ایک کردار ہی تھا لیکن ایک دن اچانک وہ کردار پردے سے غائب ہو گیا۔

گھر کے سارے لوگ پریشان ہو گئے، اِدھر اُدھر تلاش شروع ہو گئی۔ سارے رشتہ داروں سے رابطے قائم کئے گئے، سرکاری وغیر سرکاری اسپتالوں کا معائنہ کیا گیا۔ ریلوے اور پولس اسٹیشنوں پر چھاپے مارے گئے، لیکن کہیں سے بھی وہ کردار برآمد نہیں کیا جا سکا۔ تب اس کی بیوی سُہانا زاروقطار رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ——— "سُہانا جی، آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنے کردار کو ڈھونڈ لوں گا۔"

"کہاں ڈھونڈیں گے آپ، ہر ممکن جگہوں پر تو میں تلاش کر کے تھک چکی ہوں۔" سُہانا نے مایوسی ظاہر کی۔

"سُہانا جی ... ہمت سے کام لیجئے" میں نے شیخی بگھارتے

ہوئے کہا ـــــ "مجھ سے بچ کو کہاں جائے گا بچو۔ اُسے آسمان نگلنے اور زمین کھانے سے رہی ـــــ کہیں نہ کہیں تو ہوگا ہی"۔

سہانا آنسو پونچھتے ہوئے بولی ـــــ "کہیں اس سے ملنے تو نہیں چلے گئے"۔

"کس سے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بھول گئے اُسے یا اپنے کردار کی زیادتی پر پردہ ڈال رہے ہیں"۔

سہانا بدک اٹھی اور وہ سارے خطوط ایک بار پھر میرے سامنے لاکر پھیلا دیا۔

میں ان خطوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ وہ خطوط تھے جن میں میرا کردار تار تار نظر آرہا تھا۔

"لیکن یہ ممکن نہیں" ـ میں نے سہانا جی کو تسلی دیتے ہوئے کہا ـــــ "کردار کے پختہ ذہن سے ایسی امید نہیں کی جا سکتی"۔

اور پھر میں نے خطوں کے ڈھیر سے لفظوں کے شعلے لپکتے دیکھے جس میں میرا کردار جھلس رہا تھا۔ سارے خطوط ہندی میں تھے جس سے شاید بنگال کی پروردہ سہانا اچھی طرح واقف نہ تھی ویسے یہ سارے خطوط اس سے قبل بھی سہانا جی مجھ سے پڑھوا کر سن چکی تھی ۔ سہانا کو ان خطوط کے آڑے ترچھے لکیروں سے اتنا علم تو ہو ہی چکا تھا کہ کردار ، بہار کے کسی نوخیز دوشیزہ کی زلفوں کا اسیر ہے۔

"نہیں سہانا جی ـــــ نہیں۔ کردار اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح نبھانا جانتا ہے"۔ میں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے سہانا کو بہلانے کی کوشش کی ـــــ "اور پھر یہ ساری باتیں کردار کی ناتجربہ کاری کے دور کی کہانیاں ہیں۔ اس وقت کی لاابالی طبیعت پر تو ضرب لگائی جا سکتی ہے لیکن کردار کے موجودہ سنجیدہ طبیعت پر حرف لانا مناسب نہیں"۔

"نہیں بھائی نہیں ، اب بھی کردار کی چاہت جوالکھے ، اب بھی کردار اس کی اور کھینچتا ہے" ـــــ سہانا مسلسل وسوسوں کی چادر میں لپٹی چلی جا رہی تھی۔

اس طرح میں کب تک جھوٹی اور مصلحت کی کچی دیوار کھڑی کرتا رہتا،
سُہانا جی نے تو کچی دیوار کی بنیاد تک ہلا کر رکھ دی تھی اور مصلحت کی دیوار پر کھڑا میں
کانپ رہا تھا۔ اپنے کردار کے صحیح نشو ونما پر مجھے فخر تھا لیکن کمزور ٹانگوں کی کپکپاہٹ
پر کبھی کبھی میں بھی سوچ میں پڑجاتا۔ کردار کی شبیہہ بگڑتی دیکھ کر میں نے اپنی آنکھیں
موند لیں۔

جب آنکھ کھلی تو کردار پردے پر دوبارہ موجود تھا۔

ان سات آٹھ دنوں میں اس کے اندر کافی تبدیلی آگئی تھی۔ کردار
خاموش خاموش سا رہتا۔ وہ بالکل بے زبان ہو کر لوٹا تھا ایسا لگتا جیسے زبان کہیں
گروی رکھ آیا ہو۔ سبھی کی سنتا مگر اپنی زبان نہیں کھولتا۔ بس بت کی طرح سبھوں کو
نہارتا رہتا۔ سُہانا اُسے گم صُم دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔ میں بھی ہکا بکا رہ گیا۔ کل تک
ہر محفل میں چھا جانے والے چنچل کردار کی خاموشی سے میری سانسیں اکھڑی جارہی تھیں۔
مولوی کی تعویز اور گنڈے سے لیکر ایم، بی، بی، ایس، ایف، آر، سی،
ایس کے سیاہ و سفید نسخے تک آزمائے گئے لیکن کردار کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔
کردار کے اندر کے خاموش طوفان سے میں ڈر گیا تھا۔ شاید اسی لئے
اسے ساتھ لئے تاریک گوشے میں اتر آیا۔ جب کردار پر اپنی گرفت مضبوط دیکھا تو میں
اس پر پھیل گیا۔

"ویسے کردار کی اداکاری ہی ہنر ہے لیکن وقت کا صحیح نباض ہی اچھا
کردار بن سکتا ہے"۔ دیکھو میری طرف دیکھو اور وقت کو پہچانو۔ سُہانا تمہارے غم میں
کس طرح گھل رہی ہے اور بچے تمہاری فکر میں کس طرح سوکھ رہے ہیں۔ ان سبھوں
کی شادابی اور ہریالی کی قسم ــــــ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اپنے آپ کو سنبھالو، اپنے آپ کو
ہمیشہ بلند رکھو ــــــ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مجھے بتاؤ۔ تمہیں ہوا کیا ہے ــــــ
اتنے دنوں تک تم کہاں غائب رہے؟

تم خاموش کیوں ہو؟ اپنی ساری گتھیاں میرے سامنے کھول کر رکھ دو"

بھی اسے وقت کے دھاگوں میں اچھی طرح پرو سکتا ہوں۔

میرا قلم تمہارے ساتھ ہے میں تمہاری تخلیق از سرِ نو کروں گا۔ تمہیں بلند سے بلند تر بناؤں گا ـــــ تب، کردار کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ زار و قطار رونے لگا ـــــ روتا رہا ـــــ گھنٹوں روتا رہا ـــــ جب سب آنسو بہہ نکلے اور جی ہلکا ہو گیا تو اس نے کہا ـــــ۔

"میرے قلم کار دوست، میں گذشتہ دنوں ہر لمحہ ٹوٹتا اور بکھرتا رہا ہوں۔ سات دنوں تک مجھ پر جیسے عذاب اترتا رہا جس میں میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھرتا رہا ہے۔ شاید اسی لئے اب میں اپنے آپ میں سمٹ آیا ہوں۔ اب پھیلنا نہیں چاہتا۔ اسی لئے خاموشی کی دبیز چادر اوڑھ لی ہے۔ میرے بیتے ہوئے سات دنوں کی کیفیت سن کر تم بھی میرے یار قلمکار پتھر کے بن جاؤ گے۔ ٹھوس، حرکت پھر ممکن نہ ہوگی۔ تمہاری قوت سلب ہو جائے گی اور قلم بھی ـــــ۔

اس روز جب میں پردے سے نکلا تو یہ سوچ کر نکلا تھا کہ دوسرے دن پردے پر لوٹ آؤں گا۔ مجھے تو بس اسے تنبیہہ کرنی تھی کیوں کہ اسکے بار بار کے آڑے ترچھے خطوط سے میرا کردار مجروح ہو رہا تھا۔ میں اسے سمجھانے اور ایسا کرنے سے روکنے کا ارادہ لیکر نکلا تھا۔

اس کے خطوط مجھے بار بار اپنی اور کھینچ رہے تھے۔ سہانا کی شمولیت کے بعد میں اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی چاہت تھی کہ مجھ پر حاوی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وقت پر میں بدن جھاڑ کر اٹھ گیا ورنہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

"تم پہلیاں کیوں بجھا رہے ہو۔ صاف صاف بتاؤ، تمہیں ہوا کیا تھا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"یہ اُس کا آخری خط ہے"۔ خط میری اور بڑھاتے ہوئے کردار نے کہا۔

"اس کی ہدایت کے مطابق مجھے اس سے فوراً ملنا تھا ورنہ ممکن تھا وہ اپنی

جان گنوا بیٹھتی۔" کردار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ڈر کر میں نے فوراً رختِ سفر باندھا اور بغیر کسی کو کچھ بتائے نودوگیارہ ہوگیا۔

جب وہاں پہنچا تو سورج غروب ہوچکا تھا۔ ہر طرف خاموشی پھیل چکی تھی۔ اس کی ہدایت کے مطابق مجھے سورج غروب ہونے سے قبل ہی ایک مخصوص بیٹل شوپ کے ایک منفرد نوجوان سے مل کر اس کی تفتیش کرنی تھی۔ لیکن مجھے پہنچنے میں ذرا تاخیر ہوگئی تھی۔ شاید اسی لئے اس مخصوص بیٹل شوپ پر وہ موجود نہ تھا۔ بلکہ اس کی جگہ ایک لحیم شحیم شخص براجمان تھا۔ میں بار بار اس اسٹال تک جاتا اور پھر لوٹ آتا۔ اس طرح بار بار آنے جانے سے وہاں موجود لوگوں کا مرکزِ نظر بھی بن گیا تھا اس درمیان معلوم نہیں کتنی بار وہاں سے میں نے سگریٹ خریدا اور کئی بار میٹھے پتے کا پان بھی چبایا۔ اس چھوٹے سے گاؤں کی خاموش فضا میں رات فوراً ہی آدھمکتی۔

میں گھبرا گیا ـــــ اور انتظار کرنا مشکل تھا اس لئے فوراً بس اسٹاپ لوٹ آیا۔ جہاں سے آبادی والے شہر کی بس مل گئی۔ رات قریبی شہر کے ایک لاج میں گزاری۔ دوسری صبح تروتازہ ہوکر اپنے نحیف کاندھے پر مضبوط ارادے لئے گاؤں جا پہنچا۔ اس بار سورج پر شباب آنے سے قبل ہی پہنچ گیا تھا اس لئے انتظار کرنا پڑا کہ سورج سر پر آجائے تو اس منفرد نوجوان جس کا نام شاید اس نے ببلو لکھا تھا۔ مل سکوں۔ لیکن یقین مانو یار قلمکار کہ سورج پر شباب آتے آتے میں نڈھال ہوگیا تھا اور پھر کب سورج ضعیفی کا لبادہ اوڑھ کر نودوگیارہ بھی ہوگیا۔ مجھے احساس تک نہ ہوا۔ اس طرح اس دن بھی ببلو سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ اور میں رات کے اندھیرے میں قریب کی آبادی والے شہر میں لوٹ آیا کہ بیٹل شاپ پر گذشتہ دن کی طرح آج بھی وہی لحیم شحیم شخص پان کی گلوریاں لپیٹ رہا تھا۔

اس طرح دو دنوں تک صبح لاج سے نکلتا اور رات سورج غروب ہوتے ہی واپس لوٹ آتا۔ ببلو کا کہیں پتہ نہ تھا آس پاس کے دوکانداروں سے پوچھنا مناسب

نہیں سمجھتا تھا لیکن تیسرے دن جب سورج سوا نیزے پر پہنچا تو ببلو کی صورت دکھائی دی۔ گھنگھریالے بال، کتابی چہرہ، گال پر ایک تل ـــــ میں خط کی تحریر سے ایک ایک لفظ ملا رہا تھا۔ جب یقین کی حد میں داخل ہو گیا تو اس کے قریب جا کر پوچھا۔ پوچھا کہنا ٹھیک نہیں ہو گا بلکہ میں نے صرف اپنا تعارف پیش کیا۔ یعنی شہر کا نام اور اپنا..... بس وہ سمجھ گیا۔ ایسا لگا کہ جس اسکول کا میں ادنیٰ سا شاگرد بنا پھر رہا تھا وہ اس کا پرنسپل رہا ہو۔ فوراً آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سے مجھے درس دینے لگا۔"

"اُف آپ کو کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔ دراصل میں دو تین روز بیمار رہا۔ خیر ابھی اسوقت آپ مجھ سے دور ہی رہئے لیکن ہاں جب سورج پوری طرح غروب ہو جائے تو اس دوکان سے دُور اُس چوراہے پر میرا انتظار کیجئے۔ یہاں ملنا ٹھیک نہیں جائیے ابھی لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے لئے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ بہت بپھرے ہوئے ہیں۔ ذرا ہوشیاری سے کام لیجئے گا۔"

میں انتظار کرتا رہا ـــــ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد وہ آیا اور دھیرے سے کہا ـــــ۔

"میرے پیچھے ہو لیجئے ـــــ لیکن اس طرح ساتھ چلئے کہ کسی کو کچھ احساس تک نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔"

اس نے مجھے ایک، ایسی جگہ لے جا کر چھوڑا کہ شاید وہ گاؤں کا آخری سرا تھا۔ گاؤں کے اس آخری سرے کی اُس آخری دیوار کے سہارے مجھے کھڑا کر کے ببلو جو گیا مت پوچھو یار قلمکار دوست ـــــ تقریباً پون گھنٹے بعد کمبخت لوٹا اور مجھ سے کہا ـــــ

"اس دیوار کو پھاند جاؤ۔"

رات کا اندھیرا، دیوار بھی مٹی کی، وہ بھی خستہ ـــــ مگر مرتا کیا نہیں کرتا۔ اس کے سہارے میں دیوار پھاند گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ کود گیا۔ اور پھر وہ مجھے ایک نہایت ہی بوسیدہ سے جھونپڑے میں لے گیا ـــــ دور دور تک جنگل جھاڑ ـــــ شاید دیوار کے دوسرے سرے پر کوئی مکان تھا لیکن آمد و رفت کیلئے پگڈنڈی

تک کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ کمرہ کیا تھا گویا شالہ لگ رہا تھا جو اب شاید استعمال میں نہیں تھا۔ ایک چھوٹی سی چارپائی پر ایک تکیہ اور چادر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور جلانا ہی چاہا کہ اس نے روک دیا ـــــ "نہیں ـــــ روشنی سے تو خطرہ بڑھ جائے گا۔"

ببلو مجھے اس اندھیرے میں مچھروں سے لڑنے کے لئے تنہا چھوڑ کر دیوار پھاند گیا اور جاتے جاتے اتنا کہہ گیا کہ ـــــ "رات بھیگتے ہی وہ آئے گی۔"

ببلو اس کے رشتے میں ماموں زاد بھائی تھا جسے ہم دونوں کی ساری حرکتوں کا شاید علم تھا ـــــ کالج کی رنگینی اور خطوں کی چاشنی سے وہ ہی کم و بیش آگاہ تھا۔ کیونکہ میرے سارے خطوط ببلو کے پتے پر ہی جاتے تھے۔ اس کے والدین کی خفگی کی آگاہی ببلو سے ہی ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ سارا گاؤں آپ دونوں پر برہم ہے مکھیا کے لوگ آپ کو کسی وقت بھی گرفتار کر سکتے ہیں اس لئے احتیاط لازمی ہے۔

میں اندھیرے میں مرتا رہا۔ حالات سے، مچھروں سے اور اندھیرے سے لڑتا رہا کہ تقریباً نصف رات سے ذرا قبل رانی نمودار ہوئی۔

یقین مانو میرے قلمکار یار ـــــ اندھیرے میں بھی وہ دمک رہی تھی رانی کو دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھ پر چند لمحوں کیلئے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ میری رندھی ہوئی آواز سے وہ بھی کانپ اٹھی۔ اسکی بلوری آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ میرے قلمکار یار ـــــ یقین نہیں آئے گا تمہیں ـــــ رات گئے تک ہم دونوں ایک دوسرے میں اس طرح چمٹے رہے جیسے ایک جسم، ایک جان ہونے کے لئے ہڈیاں آپس میں پس رہے ہوں۔ اندھیرے میں، گھوپ اندھیرے میں، دو جسم، دو جان، دو ہاتھ اور دو آنکھیں سب آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

تم سوچ سکتے ہو میرے قلمکار یار، ہم دونوں صرف ایک دوسرے کی قربت سے ہی نہال ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ برا نہ سوچنا۔ غلط سوچ کو کبھی راہ نہ دینا کہ سچا پریمی صرف چاہت کیلئے مرتا ہے اور چاہت صرف چاہت ہوتی ہے۔

میرے یار قلمکار تم اس چاہت کی تپش اس وقت تک محسوس نہیں کر سکتے۔ جب تک خود اس گرمی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

اس اندھیرے کمرے کی گھٹی گھٹی سی فضا میں، میں نے دو راتیں اور تین دن کس طرح گزارے ہیں بیان کرنا ممکن نہیں۔ دن کے اجالے میں کونے میں دبکا بیٹھا رہتا اور رات کے اندھیرے میں جگنو کی ٹمٹماہٹ کی مانند رانی کی خوشبو میں نہال ہوتا۔ اس کے جسم کی جواں خوشبو سے مجھے ایک نئی توانائی ملتی اور میں نئے حوصلوں کے ساتھ تمام اذیتیں، کمرے کی گھٹن، رات کی تاریکی، دن کے اجالے کا خوف، سب کچھ برداشت کرتا رہا۔

رانی کے عشق کی حدت میں، میں پگھل کر ڈھیر ہوتا رہا ــــ۔

پھر خود کو سنبھالے رکھا کہ کہیں محبت رسوا نہ ہو جائے۔ میں خود کو بچتا بچاتا رہا اور رانی کو بھی سمجھاتا رہا۔

"رانی خود کو سنبھالو ــــ اور وقت کے تقاضے کو پورا کرو ــــ خود کو تماشا مت بناؤ۔"

تب رانی کہتی ــــ "وقت کے کس تقاضے کی ادائیگی چاہتے ہیں وقت کے ہاتھوں تو میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی ہوں۔"

"ہاں رانی۔ جو وقت کی قدر کرتا ہے وقت اس کی قدر کرتا ہے۔"

"وقت کی بندش کیوں لگاتے ہیں وقت سے آزاد ہو کر سوچیئے۔"

رانی سمجھائی۔

"میں مانتا ہوں کہ چاہت میں کوئی بندش نہیں ہوتی۔ لیکن یقین مانو رانی میں تمام بندشیں توڑ کر بھی تمہارے ساتھ اب انصاف نہیں کر سکتا کہ میری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ کل تک جب میں تنہا تھا تو اور بات تھی۔ دو ہی رہتا تو برداشت کر لیتا لیکن اب تیسری جان کی شرکت سے میں لرز اٹھا ہوں۔ اب میں تمہیں کسی طرح برباد نہیں کر سکتا۔ تمہاری زندگی مجھے عزیز ہے۔"

میں نے رانی کو سمجھاتے ہوئے مزید کہا ــــــ۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ تم مجھے بھول جاؤ یا میں تمہیں بھول جاؤں ــــــ
میں یہ بھی نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں اپنی اپنی محبت، اپنی اپنی چاہت کو ہم دونوں
اپنے اپنے انداز سے لیں۔ تم اپنی زندگی بسا کر میری محبت کو جواں رکھو۔ میں اپنے بچوں میں
گھر کر تمہاری محبت کو روا رکھوں لیکن شرط ہے کہ ایک دوسرے کو رسوا ہوتے سے بچاؤں۔"

میرے قلم کار یار! وہاں میں صرف اسے یہ سمجھانے ہی گیا تھا۔ اپنی محبت
کی رسوائی مجھے گوارا نہیں اور نہ ہی میں اسکی چاہت پر کوئی ضرب چاہتا ہوں۔

تمہیں یقین ہوگا میرے قلم کار یار ــــ اس روز جب میں اس سے جدا
ہو رہا تھا تو اس کی بھیگی آنکھوں سے میرا دامن تر بتر تھا۔

وہ نصف رات سے کچھ قبل کا وقت ہوگا۔ مجھے ببلو کے حوالے کرتے ہوئے رانی
تقریباً نیم جاں سی ہوگئی تھی۔ زبان گنگ ہوگئی تھی صرف آنکھوں کی زباں سے ہی جو کچھ
کہہ پا رہی تھی۔ لب خاموش تھے۔

میں اپنی پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن معلوم نہیں
کون سی قوت مجھے روک رہی تھی۔ ہر قدم منوں وزنی لگ رہا تھا۔

یقین مانو یار! میرے قلم کار ــــ اس کی بھیگی پلکیں میری آنکھوں
میں رچ بس گئی ہیں۔ یوں تو اس سے جوں جوں دور ہو رہا تھا۔ اس کا قد چھوٹا ہوتا
جا رہا تھا لیکن میرے اندر اس کی شبیہہ اب بھی بڑی قد آور نظر آرہی ہے۔

جانتے ہو کیوں؟

میرے قلم کار یار ــــ کیوں کہ اس نے تمہارے کردار کو مجروح
ہونے سے بچایا ہے۔

●●

مصنف کی دیگر کتابیں

- مغربی بنگال میں اردو افسانے کا سفر (انتخاب) ۱۹۸۲
- ٹھنڈی آنچ کا سورج (افسانے) ۱۹۸۸
- ابتداء (انتخاب) ۱۹۹۰
- ریت پر اُگا ہوا گلاب (افسانے) ۱۹۹۲
- بے ثمر حیات (افسانے) ۱۹۹۶

متاع آئندہ

- مغربی بنگال میں اردو افسانے کی پیش رفت (مضامین)
- مغربی بنگال میں اردو افسانے کا ارتقاء (تحقیق)
- احتجاجی کہانیاں (انتخاب)